حنا

ماہنامہ

MARCH 2004

ثنا ظفر

احساس کے دریچے

digest novels lovers group ❤️❤️

''بی بی جی! چھوٹے صاحب آپ کا کئی بار پوچھ چکے ہیں اور انھوں نے کہا تھا جیسے ہی آپ آئیں فوراً ان کے پاس پہنچے۔'' وہ ابھی آفس میں داخل ہی ہوئی کہ رحمت نے پیغام دیا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا تو وہ پورے دس منٹ لیٹ تھی اور پھر دو دن کی چھٹی کرنے کے بعد اس کے عتاب کا نشانہ بننا تو لازمی تھا۔ وہ دھڑکتے دل اور لرزتے قدموں کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔

''مے آئی کم ان سر۔'' ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''جی آئیے تشریف لائیے۔'' خشمگیں نگاہوں' طنزیہ جملے اور لہجے نے رہی سہی جان ہی نکال دی۔

''جی تو محترمہ تنویہ حیدر صاحبہ کتنی دنوں بعد تشریف لائی ہیں آپ؟'' اس کے جھکے سر کی طرف دیکھتے ہوئے انتہائی طنزیہ لہجے میں سوال کیا گیا۔

''دو دن بعد سر۔'' پست آواز میں جواب آیا۔

''اور آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہوا ہے؟'' اس نے پوچھا تو اس بے اختیار گھڑی کی

مکمل ناول

جانب دیکھا۔ اور پھر خفیف سی ہو کر بازو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''وہ سر...... میں تو گھر سے جلدی ہی نکلی تھی لیکن ٹریفک کی وجہ سے......؟'' اس نے دھیرے سے کہنا چاہا لیکن بات درمیان میں ہی اچک لی گئی۔

''ٹریفک میرا مسئلہ نہیں ہے مس تنوینہ حیدر میرا مسئلہ صرف وقت کی پابندی اور کام ہے۔'' وہ اپنی سیٹ کے پیچھے کھڑا ہو کر دھاڑا۔

''اور یہ چھٹیاں کس سے پوچھ کر کی تھیں آپ نے؟'' وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ٹیبل کے پاس آن رکا۔

''منصور صاحب سے۔'' آواز ہلکی سی تھی۔

''منصور صاحب سے؟ آپ اسسٹنٹ میری ہیں یا منصور صاحب کی؟'' اس کا غصہ کسی طرح کم نہ ہو رہا تھا۔ وہ خاموش رہی۔

''جواب دو۔'' وہ اچانک ہی اس کے بالکل قریب چلا آیا تو وہ ایکدم گھبرا گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اسے کچل کر رکھ دے گا۔

''مس تنوینہ حیدر علی خان۔'' وہ واپس پلٹا۔

''یہ آفس ہے کوئی پارک یا ہوٹل نہیں کہ آپ کا جب جی چاہے اٹھ کر چل دیں اور جب چاہے چھٹی منائیں۔'' اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''آپ کا مقصد تو صرف پیسے کا حصول ہے کام کریں یا نہ کریں اس سے آپ کو کیا غرض کیونکہ تنخواہ تو آپ کو ہر مہینے وقت پر مل جائے گی تو پھر کام کرنے کی کیا ضرورت عیش کریں۔'' اس کے کہنے پر وہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کیونکہ یہ سراسر الزام تھا اس پر اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی بڑے ضبط سے کھڑی تھی۔ اس الزام پر اس کی آنکھیں جھلملا گئیں اور وہ سر جھکا کر آنکھوں کو جھپک جھپک کر آنسو پیچھے دھکیلنے لگی۔

''اب اس طرح کھڑے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا جایئے اور جا کر کام کیجیے اپنا۔'' اجازت ملنے پر وہ اپنے وجود کو گھسیٹتی باہر آ گئی۔

ہال میں نظر دوڑائی تو ابھی ایک دو ورکر ہی آئے تھے وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''ان کا سارا غصہ ہمیشہ مجھ پر ہی نکلتا ہے جیسے میں ہی لیٹ آتی ہوں باقی سب تو ان کے چہیتے ہیں ایک میں ہی ان کی زرخرید غلام ہوں۔'' وہ سوچتے ہوئے شاید اپنے کام کی نوعیت کو بھول گئی تھی۔

''ہاں سن جو لیتی ہوں سب کچھ اس لیے معلوم ہے ناں جو مرضی کہہ لو جس طرح مرضی ذلیل کر دو یہ کہیں نہیں جائے گی، مجبور جو ٹھہری۔'' وہ فائلوں کو ادھر ادھر کرتے مسلسل بڑبڑائی رہی تھی۔

''اور یہ تانیہ اور تنویر بھی ابھی تک نہیں آئے اور مجھے یقین ہے کہ ہمیشہ کی طرح انھیں کچھ بھی نہیں کہیں گے معلوم ہے نہ انھیں کچھ کہا بھی تو جاب کو ٹھوکر مار کر چلے جائیں گے کیونکہ وہ مجبور نہیں ہیں۔'' وہ فائل کھولے کچھ لکھنا چاہتی تھی لیکن آنسوؤں کے پردے راہ میں بار بار حائل ہو رہے تھے۔ اور جب بالکل ہی ضبط نہ کر سکی تو ٹیبل پر سر رکھے روتی چلی گئی۔

''اے تمہیں کیا ہوا؟'' تانیہ اس کے سر پر کھڑی پوچھ رہی تھی۔ اس نے سر اٹھایا تو چہرہ آنسوؤں سے تر اور آنکھیں سرخ تھیں۔

''ہیں...... تم تو رو رہی ہو کیوں......؟'' وہ جواب دینے کی بجائے چہرہ اور آنکھیں صاف کرنے لگی۔ اور وہ جیسے خود ہی سب سمجھ گئی۔

''ہوں آج پھر ڈانٹ پڑی ہے۔'' اس نے اپنی ٹیبل پر بیگ رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

جواباً وہ سوال [illegible]

''بھئی دو دن بعد آئی ہو ڈوز تو ملنا تھی ناں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''دس منٹ لیٹ بھی۔'' اس نے ناک رگڑتے ہوئے معصومیت سے خود ہی بتایا تو تانیہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''یار اتنا انتظار کرواؤ گی تو ڈانٹ تو پڑے گی ناں۔''

''بکومت۔'' اسے غصہ آ گیا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔'' اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''کیوں ڈرتی ہو تم اسی لیے تو وہ شیر ہو جاتا ہے بس ڈٹ جاؤ یہ صرف گیدڑ بھبکیاں ہیں جس طرح رات کے اندھیرے میں گیدڑ اپنے اندر کا خوف چھپانے کے لیے چلاتا ہے ناں تو ان کا بھی یہی حال ہے۔'' وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

رونے کے بعد اندر کا غبار کچھ کم ہوا تو وہ کام کی طرف متوجہ ہوئی اور پھر سارا دن اسے سر اٹھانے کی بھی صرت نہیں ملی کہ دو دن کا جمع کام بھی اسے آج ہی کرنا تھا۔ مصروفیت کی وجہ سے اسے وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ چونکی تو وہ اس وقت جب اس کے سر پر آن کھڑا ہوا۔

''کیا اب رات یہیں گزارنے کا ارادہ ہے؟'' لہجہ کاٹ دار تھا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا اور نا سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

''چھٹی ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے محترمہ۔''

''اوہ.....'' وہ ایک دم ہی پریشان ہوگئی اور فوراً ریسٹ واچ پر وقت دیکھا تو کھڑی ہوگئی۔ اسے یاد آیا ابھی کچھ دیر پہلے تانیہ نے اسے مخاطب کیا تھا۔

''لو جی ہمارے تو فیانسی آ گئے ہم تو چلے تم کب نکلو گی؟''

''ہاں بس تھوڑا کام رہ گیا ہے' ابھی اٹھ رہی ہوں۔'' اسنے مصروف انداز میں جواب دیا تھا۔

اور اسے احساس ہی نہ ہوا کہ یہ سب ایک گھنٹہ قبل کی باتیں ہیں۔

اس نے جلدی جلدی چیزیں سمیٹیں' چادر اوڑھ کر کچھ فائلیں بھی اٹھا لیں اور تیزی سے آفس سے باہر آئی تو وہ گاڑی پارکنگ سے باہر نکال رہا تھا۔ وہ روڈ پر پہنچی تو ٹریفک کے بے ہنگم شور نے اس کا استقبال کیا۔ سڑکوں پر بے پناہ رش تھا۔ کان پڑی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ اسے سڑک کراس کرنا تھی لیکن رش اتنا تھا کہ دس منٹ یہی سوچتے گزر گیا کہ کہاں سے گزرے۔ اور بمشکل تمام اس نے یہ پہاڑ سر کیا۔ پھر پروین کے انتظار میں کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شل ہوگئیں۔ ہر دو منٹ بعد آنے والی ویگنوں میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ اس نے چکراتے سر کے ساتھ گہری ہوتی شام کو دیکھا تو گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ آخر خدا خدا کر کے ایک وین کی فرنٹ سیٹ پر پہلے سے موجود دو سواریوں کے ساتھ جگہ ملی۔ اس نے بیٹھتے ہی چکراتے سر کو تھام کر بے قابو ہوتے حواس کو قابو میں کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اور پھر اسے کچھ پتا نہ چلا کہ ایک گھنٹے کا سفر کس طرح تمام ہوا۔

''اترو بی بی۔' کنڈیکٹر کی آواز پر اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھا۔

''آپ کا سٹاپ آ گیا ہے جی۔'' اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور اپنی تمام ہمتیں مجتمع کرتی ہوئی باہر آئی۔ اسے لگا کہ اگر وہ چند سیکنڈ بھی کھڑی رہی تو گر جائے گی۔ وہ سڑک کے ساتھ ہی کھڑے جوس والے کے بینچ پر بیٹھ گئی۔ ایک گلاس جوس پینے کے بعد اس کے کچھ ہوش ٹھکانے آئے تو پیسے دیتے ہوئے اندھیرے میں ڈوبے آسمان کی طرف دیکھا جہاں اب کچھ ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ وہ گہری سانس لیتے ہوئے اٹھی اور ٹریفک کے شور سے نجات پانے

کے لیے تیزی سے قدم بڑھا دیئے۔ اسے اب پندرہ منٹ کا فاصلہ پیدل ہی طے کرنا تھا۔ وہ اندر ہی اندر خود کو گھر پہنچ کر پیش آنے والی صورتحال کے لیے تیار کر رہی تھی۔ نجانے ذلت و رسوائی اس کا مقدر کیوں بن گئی تھی۔ آنکھوں میں امڈ آنے والے آنسوؤں کو چادر کے پلو سے صاف کیا۔ حسب توقع دروازہ ممانی نے کھولا۔

''السلام علیکم۔'' اور وہ جواب دینے کے بجائے بولیں۔

''آ گئیں شہزادی صاحبہ۔'' لہجے میں طنز و حقارت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

''خود تو عیش کرتی پھرتی ہو کچھ اس پالنے والی کا بھی خیال ہے جس نے پال پوس کر اس قابل بنا دیا احساس فراموش۔'' وہ سنی ان سنی کرتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ ان کی تلخ باتوں کے جواب میں وہ خاموش ہی رہتی تھی۔ لہٰذا اس وقت بھی خاموشی سے اوپر آ گئی۔ اماں اسے دیکھتے ہی بولیں۔

''آ گئیں میری بچی۔'' لہجے میں انتظار کی تڑپ واضح تھی۔

''السلام علیکم اماں۔'' اس نے فائلیں اور بیگ انھیں تھماتے ہوئے کہا۔

''آج اتنی در کر دی۔' وہ جواب دینے کے فوراً بعد پوچھنے لگیں۔

''بس اماں۔'' وہ اتنا کہہ کر سامنے بچھی چارپائیوں میں سے ایک پر ڈھے گئی۔ اماں چیزیں اندر رکھ کر واپس آئیں تو اس کی زرد ہوتی رنگت دیکھ کر ہول گئیں اور جلدی سے دودھ میں انرجائل ملا کر لے آئیں۔

''کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''جی اماں۔'' بنا آنکھیں کھولے جواب دیا۔

''لو یہ پی لو۔''

''نہیں اماں میرا کچھ بھی پینے کو جی نہیں چاہ رہا۔''

''پی لے بیٹا طبیعت سنبھل جائے گی۔''

''میں نے وین سے اترتے ہی جوس پیا تھا

اماں نے گہری سانس لے کر گلاس وہیں ایک سائیڈ پر رکھ دیا۔

''میں تو آج تمہارے جانے کے بعد سے ہی بڑی فکر مند تھی دو دن بخار میں جلتی رہی ہو اوپر سے اتنی گرمی اور پھر اتنی محنت اور آنے جانے کی تھکن علیحدہ۔ منع بھی کیا تھا کہ مت جاؤ لیکن تم میری سنتی کہاں ہو اور پھر اتنی دیر سے بھی آئی۔ برے برے خیالوں سے تو میرا دل ہی ہولا جا رہا تھا۔''

اماں کی بات پر ہلکی سی تلخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ کر دم توڑ گئی کہ صبح والا واقعہ بھولا نہیں تھا اسے۔

''اماں دو دن بعد ہی گئی ہوں تو اتنا کام تھا کہ سارا دن سر اٹھانے کی بھی فرصت نہیں ملی اور ایم۔ڈی صاحب کی ڈانٹ الگ۔'' وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

''دوپہر کا کھانا بھی کھایا یا نہیں؟''

اماں کے پوچھنے پر اسے یاد آیا کہ تانیہ کے کہنے کے باوجود کچھ غصے اور کچھ مصروفیت کی وجہ سے وہ لنچ گول کر گئی تھی اور اب اسے اپنی اتنی زیادہ کمزوری کی وجہ سمجھ آئی تھی کہ صبح بھی دیر ہو جانے کی وجہ سے صرف ایک کپ چائے پی کر نکل گئی تھی۔ سارا دن بھوکے پیٹ اتنی محنت تو پھر حواس کہاں قابو رہتے ہیں لیکن اماں کے خیال سے اس نے جھوٹ بولا۔

''جی اماں کھا لیا تھا۔'' لیکن وہ ماں تھیں جان گئیں۔

''اپنا خیال رکھا کرو میری بچی کیا حالت ہو گئی ہے تیری۔'' انھوں نے اس کے چہرے پر آئے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''پھول جیسا چہرہ کملا کر رہ گیا ہے مت کیا کرو اتنی محنت کیوں اتنی جان مار رہی ہے؟'' اماں

کے لہجے میں اس کے لیے فکر مندی تھی۔

''تو پھر کیا کروں اماں کیا بھوکے بیٹھے رہیں؟'' اس نے ماں کے ہاتھ تھام لیے۔

''آہ ہا۔'' اماں نے طویل آہ بھری۔

''تیرا باپ زندہ ہوتا تو تجھے اتنے دھکے نہ کھانے پڑتے۔''

''کون سا باپ؟'' اس نے شرارت سے مسکرا کر پوچھا تو اماں اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

''تنوینہ میری بات مان لے نہ کھا ہم لوگوں کی خاطر اتنے دھکے تو زرینہ کے پاس چلی جاوہ تجھے شہزادیوں کی طرح رکھے گی۔''

''بس کریں اماں۔ اپنے آرام کی خاطر آپ لوگوں کو چھوڑ دوں اور اس عورت کے پاس چلی جاؤں جس نے مجھے کبھی بیٹی کہہ کر پکارا بھی نہیں۔''

''اور آپ جنھوں نے مجھے یتیمی کے دور میں سہارا دیا پال پوس کر اس مقام تک پہنچا دیا کہ میں اس معاشرے میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہوئی ہوں۔ اور اب ایسے کڑے وقت میں آپ کو چھوڑ کر چلی جاؤں۔ اماں پلیز آپ ایسی باتیں مت کیا کریں جس سے میرا دل دکھے۔ مجھے لگتا ہے آپ بچوں کے ساتھ بھی ایسی باتیں کرتی ہیں۔ ابھی کل ہی زین مجھ سے کہہ رہا تھا کہ آپا ہم نے آپ پر بہت بوجھ ڈالا ہے۔''

''ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔'' ان کے کہنے پر وہ دکھ سے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

''اماں کیا میں آپ کی کچھ بھی نہیں؟'' اس کے لہجے میں نمی تھی۔ اماں نے تڑپ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

''ایسے نہ کہہ تنوینہ میرے لیے جو تو ہے وہ نائمہ اور زین بھی نہیں۔ اور اس حقیقت سے تو بھی بہت اچھی طرح واقف تھی۔''

''تو پھر کیوں پریشان ہیں ممی آپ بس کچھ

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیے

ابنِ انشاء

طنز و مزاح، سفر نامے

اردو کی آخری کتاب
آوارہ گرد کی ڈائری
دنیا گول ہے
ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں
چلتے ہو تو چین کو چلیے

قدرت اللہ شہاب

یا خدا
ماں جی

بابائے اردو مولوی عبدالحق

قواعد اردو
انتخاب کلام میر

ڈاکٹر سید عبداللہ

مقامات اقبال
لطیف غزل
لطیف اقبال
لطیف نثر

مکمل فہرست طلب کیجیے

لاہور اکیڈمی

۵-۲- سرکلر روڈ
لاہور

digest novels lovers group

عرصے کی بات ہے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا انشاءاللہ۔ اور ایک بات میری یاد رکھیں میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ اور آپ وعدہ کریں آیندہ آپ ایسا کچھ نہیں کہیں گی؟''

''میرا کون سا دل کرتا ہے کہ تو کہیں جائے بس میں تو تیرے ہی خیال سے کہہ رہی ہوں' کہ اب تیری نوکری کی نہیں شادی کی عمر ہے۔''

''لیجیے یہاں روٹی کے لالے پڑے ہیں اور انھیں شادی کی پڑی ہے۔ اماں مقررہ وقت سے پہلے کچھ نہیں ہو سکتا آپ پریشان نہ ہوا کریں۔ اور بس اب جلدی سے اٹھ جائیں مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔ میں نہانے جا رہی ہوں۔''

''ہاں تم میں اتنے میں ان دونوں کو بلاتی ہوں۔''

''کہاں ہیں دونوں؟''

''نائمہ کو گڑیا بلا کر لے گئی تھی اور زین کہیں اپنے دوستوں کے ساتھ ہوگا۔'' اماں کہتی ہوئیں سیڑھیاں اتر گئیں اور وہ سوچتی ہوئی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

.....

محمد صابر کا تعلق متوسط طبقے کے ایک گھرانے سے تھا۔ بچے خدا نے تین ہی دیئے تھے۔ جس کی وجہ سے کم آمدنی میں بھی سفید پوشی کا بھرم قائم تھا۔ وہ دو بڑے بچوں بیٹا اور بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ جبکہ چھوٹی بیٹی زرینہ ابھی کالج جاتی تھی۔ کالج آتے جاتے اپنی سادگی اور معصوم صورت کے باعث ایک رئیس زادے کے من کو بھا گئی اور ایسی بھائی کہ وہ رشتہ بھجوانے پر مجبور ہو گیا۔

اتنے اونچے گھرانے سے رشتہ آنے پر سارے خاندان میں کھلبلی سی مچ گئی اور ایک وہ تھی جو آگے پڑھنا چاہتی تھی اس اچانک افتاد پر گھبرا گئی کہ نجانے اب کون کون سے افسانے اس کی ذات سے منسوب کیے جائیں گے۔ وہ لوگ اتنے بڑے گھر میں بیٹی بیاہنے سے گھبرا رہے تھے۔ لہذا سوچ بچار کے بہانے چھان بین کے لیے وقت مانگا گیا۔

لڑکے کا باپ شجاعت علی خان شکل و صورت سے تو خاصا پروقار اور پرخلوص لگتا تھا لیکن ماں کے چہرے پر رعونت و تکبر واضح تھے۔ صاف لگتا تھا کہ زبردستی لائی گئی ہے۔ لیکن پھر شجاعت علی خان کی بار بار آمد اور اصرار یقین دہانی پر انھیں ہاں کہنا پڑی۔ اور پھر چٹ منگنی پٹ بیاہ کی مثال صادق آئی۔

شادی کی پہلی رات ہی زرینہ پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ حیدر علی خان نے اسے کالج آتے جاتے دیکھا تو اپنا دل انھیں راہوں پر کھو بیٹھا۔ وہ واقعی اسے بہت چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا کہ شادی گھر والوں کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے۔ صرف پاپا ایسے ہیں جو میری خوشی میں خوش ہیں۔

''دیکھو زرینہ تمہیں پانے کے لیے میں نے اپنے سگے اور خونی رشتوں کو ناراض کیا ہے۔ ماما میری شادی اپنی اکلوتی بھتیجی سے کرنا چاہتی تھیں جو کہ کروڑوں کی جائیداد کی تنہا وارث تھی۔ بھائی جان کو میرا انتخاب اس لیے پسند نہیں آیا کہ وہ سمجھتے ہیں کہ میں نے ترقی کی راہیں اپنے لیے مسدود کر لی ہیں۔ دونوں بہنیں اس لیے ناخوش ہیں کہ جو ماما کہہ رہی ہیں وہی ٹھیک ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک میرا بھی یہی حال تھا لیکن تمہیں دیکھتے ہی دل باغی ہو گیا۔ وہ تو شکر ہے پاپا نے میرا ساتھ دیا اور اگر نہ بھی دیتے تو میں تمہیں ضرور حاصل کرتا۔ کیونکہ تم وہ واحد لڑکی ہو جس نے میرے دل کی دنیا کو تہہ و بالا کیا۔''

وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے بول رہا تھا اور وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

پھر گزرتے وقت نے یہ سچ ثابت کر دکھایا کہ حیدر اسے کتنا چاہتا ہے۔ وہ اس کی محبتیں پا کر بے پناہ خوش تھی۔ لیکن ساس نندوں کا رویہ اسے دکھی کر جاتا۔ اور اس کی اس پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے حیدر نے علیحدہ گھر بنوانے کا تہیہ کر لیا کیونکہ جانتا تھا کہ ماں بہنوں کے رویے نہیں بدل سکتے اور وہ اسے پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''بس جانم کچھ عرصہ انتظار کر لو پھر میں تمہیں ایک ایسے محل میں لے جاؤں گا جہاں محبتیں ہی محبتیں ہوں گی اور ہم دونوں کے سوا تیسرا کوئی نہ ہوگا۔'' وہ اسے بانہوں میں بھر کر تسلی دیتا جبکہ وہ مزید حراساں ہو جاتی۔

''نہیں حیدر ماما تو پہلے ہی مجھ سے خائف ہیں اس طرح اور بدظن ہو جائیں گی کہ اس کا بیٹا ان کی نظروں سے بھی دور کر دیا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تم بہت اچھی ہو زری اس لیے ایسا سوچتی ہو جبکہ میں اپنے گھر والوں کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔''

اور وہ جو کہ اپنی ساس نندوں کا دل جیتنا چاہتی تھی حیدر کی غیر موجودگی میں ہر وقت آتے جاتے اس پر طنز کی جاتی اور اسے ایسے القابات سے نوازا جاتا کہ اس کے تمام ارادے متزلزل ہو جاتے اور پھر وہ بھاگ کر پاپا کے کمرے میں پناہ لیتی۔ وہ واقعی بہت شفیق باپ تھے اپنی اولاد کے لیے فکرمند رہنے والے اور آج کل وہ اپنی بڑی بیٹی شہیرا کے لیے پریشان تھے کہ وہ طلاق لے کر واپس گئی تھی۔ اس کی فکر نہ تو اس کی ماں کو تھی اور نہ خود اسے۔

شادی کو ابھی ایک سال ہی گزرا تو ساس نندوں نے واویلا مچا دیا کہ ابھی تک بچہ پیدا کیوں نہیں ہوا۔ حالانکہ وہ جس سوسائٹی سے تعلق رکھتی تھیں وہاں شادی کے بعد پانچ چھ سال تک بچے کو ایک خطرہ تصور کیا جاتا تھا لیکن انھیں تو اسے تنگ کرنے کا ایک نیا بہانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ خوشی بھی دے دی تو اسے لگا کہ اب کوئی غم اس کے پاس نہ بھٹکے گا۔ ان دونوں کے ساتھ ساتھ پاپا بھی بہت خوش تھے۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے حیدر کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے تو قبل از وقت ہی کمرے میں کھلونوں اور کپڑوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ وہ اپنے جیتے جاگتے کھلونے کا بڑے جوش و خروش سے استقبال کرنا چاہتا تھا۔

''زرمینہ ہمارا بچہ ہاسپٹل کے بعد سب سے پہلا قدم اپنے نئے گھر میں رکھے گا۔ میں اسے یہاں ان نفرتوں کا سامنا کرنے کے لیے نہیں لاؤں گا۔ کیونکہ میرا بچہ صرف اور صرف محبتوں کے لیے پیدا ہوگا اور میں دنیا کا کوئی غم کوئی پریشانی اس کے قریب نہ آنے دوں گا۔'' وہ اکثر و بیشتر زرمینہ سے کہتا تھا۔ لیکن تقدیر سے بڑا ستمگر کوئی نہیں انسان قسمت کے آگے بڑا بے بس ہے۔

وہ تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے ہی اسے گیٹ پر سی آف کر آئی اور اب کمرے کی حالت درست کرتی وہ گنگناتے ہوئے ایک ایک چیز کو بڑے پیار سے سنبھال رہی تھی کہ شجاعت علی خاں بڑی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئے اور بولے۔

''زرمینہ سنو جلدی کرو میرے ساتھ آؤ۔''

وہ یہ کہتے ہی دوبارہ نکل گئے۔ اور وہ حراساں سی ان کے پیچھے ہی نکلتی چلی گئی۔

ہسپتال کے اندر پہنچنے سے پہلے ہی ڈاکٹرز حیدر کی ڈیڈ باڈی کو ایمبولینس میں رکھ چکے تھے۔ نجانے وہ کون ظالم تھا جو کہ اتنا بڑا ٹرالر آنکھیں بند کر کے ڈرائیو کر رہا تھا کہ اسے سامنے سے آتی

حیدر کی گاڑی نظر نہ آئی تھی۔
حیدر کی آنکھیں کیا بند ہوئیں اس کی تو دنیا ہی اندھیر ہوگی تھی۔ اسے رہ رہ کر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ جب جناہ اٹھا وہ اس وقت بھی بے ہوش تھی۔ اس جوان موت پر یہاں موجود ہر فرد کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ یاما کی حالت بھی ابتر تھی وہ رہ رہ کر اسے کوس رہی تھیں۔
''ڈائن کھا گئی میرے بچے کو' برباد کر دیا مجھے' ہائے میرا بچہ۔'' وہ سینے پر ہاتھ مار کر روئیں اور پھر ایک دم ہی اس پر جھپٹ پڑیں۔
''بس کر' بند کر یہ ڈراما بازی' میرا گھر لوٹ لیا اب اور کیا چاہیے تجھے؟''
''حالدہ پاگل ہوئی ہو کیا ہوش کے ناخن لو۔'' شجاعت خان نے بمشکل اسے چھڑایا تو وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔
''دفع کر دو اسے یہاں سے۔ میں اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی نکالو اسے گھر سے باہر۔'' انھوں نے بیہوش پڑی زرینہ کو ٹھوکر ماری۔
''خالدہ ہوش میں آؤ۔'' شجاعت علی خاں انھیں زبردستی پکڑ کر دوسری طرف لے گئے۔
زرینہ کے گھر والے بھی یہاں موجود تھے آخر وہ اپنی بیٹی کی اس طرح تذلیل ہوتے کب تک برداشت کرتے اور ویسے بھی یہاں اب باقی کیا بچا تھا سب کچھ تو ختم ہوگیا تھا۔ دو سال کی بیاہتا بیوہ ہو چکی تھی۔ سسرال میں اس کا کوئی غمگسار نہ تھا۔ تو ایسی صورتحال میں وہ اسے کیسے یہاں رہنے دیتے۔ وہ لوگ اسے سوئم کے بعد لے گئے۔
''تم نے بہت برا کیا ہے خالدہ' بہت برا۔'' شجاعت علی خاں کو بے حد افسوس تھا۔
''کیا برا کیا ہے میں نے اس نے کون سا نیکی کی تھی ہمارے ساتھ میرا بیٹا مجھ سے چھین کر۔'' خالدہ بیگم چلائیں تو شجاعت علی خاں نے تاسف سے ان کی طرف دیکھا۔
''اس کا نہیں تو کم از کم آنے والے بچے کا ہی خیال کیا ہوتا جو تمہارے بیٹے کی نشانی ہے۔''
''کون سا بچہ؟'' ان کے لہجے میں حقارت تھی۔
''جس نے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی میرے بیٹے کو نگل لیا۔''
''جاہلوں جیسی باتیں مت کرو۔''
''ہاں ہاں میں جاہل ہوں بیوقوف ہوں لیکن اب وہ اس گھر میں نہیں آئے گی۔'' وہ چلائیں۔
''اب اس کا یہاں رکھا ہی کیا ہے جو وہ یہاں آئے گی۔؟'' شجاعت صاحب نے انتہائی کرب سے کہا۔ اور خاموشی سے اندر بڑھ گئے۔

.....

وہ آبلہ پا سارے گھر میں پھرتی لیکن بے قرار دل کو کسی طرح قرار نہ تھا۔ رو رو کر آنکھیں بھی خشک ہوگئیں تھیں۔ اس کی سسکیاں اس کے اندر ہی دم توڑ جاتیں۔ پہلے وہ جن چیزوں کو دیکھ کر خوش ہوتی تھی اب انھیں سینے سے لگائے گھنٹوں روتی۔ اماں بابا اس کا غم اپنے دلوں پر محسوس کرتے لیکن تقدیر کے آگے بے بس تھے۔ بابا تو اس غم کو سہہ نہ سکے۔ اور جلد ہی اس دنیا سے کوچ کر گئے اور اماں زندہ درگور ہوگئیں۔ تقدیر نے ان کے ساتھ کیسا کھیل کھیلا تھا۔
وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔ لیکن اسے لگتا کہ جیسے وقت رک گیا ہو۔ اسے ہر چیز سے اداسی اور ویرانی ٹپکتی ہوئی محسوس ہوتی۔ وہ گھنٹوں ایک نقطے پر نظریں جمائے خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جس کا انتظار تھا کمزوری کے باعث نارمل کیس بھی بگڑ گیا۔
زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو کر اس

نے ایک صحت مند اور گول مٹول بچی کو جنم دیا۔ ہوش میں آتے ہی بچی کو دیکھنے کی خواہش کی تو اماں نے اسے اس کی گود میں دے دیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بے اختیار ہوگئی اور سینے سے بھینچ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہاں موجود ہر فرد کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔

وہ ابھی اپنی بچی کو ٹھیک طرح سے دیکھ بھی نہ پائی تھی کہ اس کی بڑی بہن جن کی شادی کو آٹھ سال ہوگئے تھے مگر گود ابھی تک سونی تھی اپنی جھولی پھیلائے چلی آئیں۔ اور ان کا مطالبہ اس کا دل بند کرنے کے لیے کافی تھا۔

''نہیں آپا نہیں میں حیدر کی نشانی کو آپ کے حوالے کر دوں؟ یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔'' اس نے بچی کو بانہوں کے حصار میں لے کر سینے سے لگا لیا۔ اور آپا بے بسی سے اماں کی طرف دیکھنے لگی۔

''آپا ٹھیک کہہ رہی ہیں زرینہ۔'' یہ بھابی تھیں۔

''آپ یہ سب اس لیے کہہ رہی ہیں کہ کہیں میں اور میری بچی آپ پر بوجھ نہ بن جائیں۔ لیکن میں اس کو کسی پر بوجھ نہیں بننے دوں گا۔''

''تم ہمیں غلط مت سمجھو زرینہ۔'' بھائی جان نے آگے بڑھ اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ہم تمہارے ہی بھلے کے لیے کہہ رہے ہیں بیٹا ہوتا تو اور بات تھی لیکن یہ بیٹی ہے تم اکیلی اس کی ذمہ داری نہیں نبھا سکتیں۔''

''کیا آپ لوگ میرا ساتھ نہیں دیں گی؟'' اس نے التجائیہ نظروں سے بھائی کی طرف دیکھا۔

''ہم تمہاری بہتری کا سوچ رہے ہیں بیٹا۔ اب تم خود سوچو کہ آج منہ موڑنے والے کل اگر اس کے دعویدار بن کر آگئے تو تم کیا کرو گی؟'' انھوں نے کہا تو وہ بے بسی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''زرینہ میری بہن میں تیری بچی کو سگی اولاد سے بھی زیادہ چاہوں گی اسے تیری امانت سمجھ کر پالوں گی۔ دیکھ تو تو ابھی جوان ہے تیری شادی ہوگی تو مجھے اور بچے بہت اور میں.....'' آپا کی آواز رندھ گئی۔

''دیکھ میں تیرے در پر سوالی بن کر آئی ہوں مجھے نامراد نہ لوٹا۔'' انھوں نے واقعی اپنا دامن پھیلا دیا۔ لیکن وہ ایسا دل کہاں سے لاتی کہ اپنی گود سنسان کر کے ان کا دامن بھر دیتیں۔

''دیکھو زرینہ بہن بیٹیوں کو ہمیشہ باپ کے سائے کی ضرورت ہوتی ہے اور میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری بیٹی کو باپ کی شفقت اور بھرپور تحفظ دوں گا کہ اسے کبھی سگے باپ کی کمی محسوس نہ ہوگی۔'' جمال بھائی نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

اور پھر آپا اور جمال بھائی کی منتوں اور سب کے سمجھانے بجھانے پر اس نے اپنی گود خالی کر کے آپا کا دامن بھر دیا۔ اپنے حیدر کی نشانی کو دوسروں کے حوالے کر دیا۔ اور حیدر کے گھر والوں کو پیغام بھجوایا کہ ''بچی مردہ پیدا ہوئی تھی۔''

''چلو خس کم جہاں پاک'' دادی نے سن کر کہا۔

لیکن جب شجاعت علی خاں اس سے ملنے آئے تو وہ ان سے کچھ بھی نہ چھپا سکی۔ انھوں نے بھی اس کی قربانی کو سراہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے ان کے گھر میں بچی کے لیے کبھی جگہ نہیں بنے گی ان حالات میں زرینہ کا یہ فیصلہ درست تھا۔ اس کے درد سے تو سب آشنا تھے۔

وہ تنہا بیٹھی اپنے خالی دامن کو تکتی رہتی۔ قدرت نے اس کے ساتھ کتنا سنگین مذاق کیا تھا۔

''آخر یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہوا؟'' وہ خود سے سوال کرتی اور رونے لگتی۔ لیکن

آخر کب تک وہ خود فراموشی کی حالت میں رہ سکتی تھی۔ اماں کی خاطر اسے خود کو سنبھالنا پڑا کہ اب اس کی زندگی کا وہ آخری سہارا تھیں۔ ان کی دن بہ دن گرتی ہوئی صحت ایک اور خطرے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ اور پھر اس نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے دوبارہ کالج میں ایڈمیشن لے لیا۔

.....

تنویہ جب سے اس گھر میں آئی تھی ایکدم سے سب کچھ بدل گیا تھا۔ جس آنگن میں پہلے سناٹے گونجتے تھے اب وہاں اس کی چہکاریں گونجتیں۔ دونوں میاں بیوی کے ہاتھ تو ایک کھلونا آ گیا تھا۔ ہر وقت اس کے ہی آگے پیچھے رہتے۔ اس کے ذرا سے رونے پر دونوں دوڑے چلے آتے۔ ذرا سی چوٹ پر دونوں بے چین ہو جاتے۔ ان کی خوشیاں اور غم تو اب تنویہ سے ہی منسوب تھے۔

زرمینہ تقریباً روزانہ ہی آ جاتی اور اسے لپٹائے ایک ٹک تکے جاتی۔ اس کے مسکرانے پر مسکراتی منہ بسورنے پر منہ بسورتی۔

''زرمینہ دیکھا تو نے بالکل تیرے جیسی ہے۔ مجھے یاد ہے جب تو اتنی سی تھی تو بالکل ایسی تھی۔'' آپا کہتی تو وہ اسے اپنے ساتھ لپٹا لیتی۔

.....

تنویہ نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھ لیا تھا۔ اب وہ اپنے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر چلتی تو سب اس پر سو جان سے فدا ہوتے۔

زرمینہ کو شادی کے لیے سب زور دے رہے تھے لیکن وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حتیٰ کہ حیدر کے والد شجاعت علی خاں نے بھی یہی مشورہ دیا تھا؟ اماں بیمار ہوئیں تو ان کا یہ مطالبہ زور پکڑ گیا۔

''اماں میں شادی کر کے پہلے کون سا سکھ دیکھے ہیں جو پھر کر لوں۔'' وہ ان کی بات سن کر رو پڑی۔

''نہیں بیٹی مقدر سدا ایک سا نہیں رہتا میری زندگی میں تجھے کوئی سائبان مل جائے تو میں بھی سکھ کی موت مر سکوں گی۔ کب تک بھائی کی چوکھٹ پر بیٹھی رہے گی۔ آج جو بھاوج اچھی ہے لیکن کل کو اگر منہ موڑ لے تو کہاں جائے گی تو۔ سدا وقت ایک سا نہیں رہتا بیٹی اپنوں کے پرائے ہونے میں دیر نہیں لگتی۔'' اور پھر اماں کے سمجھانے اور اصرار پر شجاعت علی خاں کے توسط سے ہی اس کی شادی ہو گئی۔

تنویہ اس وقت چار برس کی تھی اور سکول جانے لگی تھی۔ اور پھر اس نے اپنی بیٹی کی خوشیوں کی خاطر اپنے سینے پر صبر کی ایک بھاری سل رکھ لی اور پلٹ کر کبھی تنویہ کی خبر نہ لی۔

تنویہ سات برس کی ہوئی تو خدا نے معجزہ دکھایا۔ زرینہ اور جمال کی خوشیوں کی کوئی انتہا نہ تھی جب شادی کے پندرہ سال بعد انھیں اولاد کی نوید ملی۔ اور جب ثمینہ نے ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا تو جمال نے تنویہ کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر گھما دیا اور چٹا چٹ پیار کرنے لگا کہ اس کے ہی قدم مبارک تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی بھی سن لی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سگی اولاد کے آنے پر اس کی طرف سے توجہ کچھ کم ہو جاتی لیکن یہاں صورتحال مختلف تھی۔ اب تنویہ انھیں پہلے سے بھی زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔ اور پھر نائمہ کے تین سال بعد زین بھی اس دنیا میں آ گیا تو ہر طرف خوشیوں کے شادیانے بجائے گئے دونوں میاں بیوی تو تنویہ کی بلائیں لیتے نہ تھکتے۔

وقت گزرتا رہا جیسے ہی اس نے سن شعور میں قدم رکھا اس پر تمام حقیقتیں آشکار کر دی گئیں کہ کل کلاں اگر اسے کسی اور ذرائع سے معلوم ہوا جائے تو وہ دلبرداشتہ نہ ہو۔ اسے جب سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی اپنی اولاد نہیں تو وہ ان کی اتنی

محبتوں کے باوجود ایکدم سے خاموش رہنے لگی۔
ہر وقت چہکنے والی تنوینہ نے چپ سادھ لی۔ اپنی حقیقی ماں کو دیکھنے کی فطری خواہش اس کے اندر پروان چڑھنے لگی۔ لیکن اس وقت اس کا سارا شوق دھرا رہ گیا جب اس پروقار اور خوبصورت سی عورت نے رسمی سے انداز میں اس کے گال تھپتھپائے اور اماں سے باتوں میں مشغول ہوگی۔ تو وہ آنکھوں میں ڈھیروں آنسو لیے باہر صحن میں آ بیٹھی۔

''اس سے زیادہ پیار تو مجھے راہ چلتے لوگ کر لیتے تھے کہ دیکھو کتنی پیاری بچی ہے۔'' اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے سوچا اور پھر اس کے دل سے تمام شکوک وشبہات دھل گئے۔

''نہیں صرف اماں ہی میری ماں اور بابا ہی میرے باپ ہیں۔'' اور یہ فیصلہ کرتے ہی وہ بالکل ہلکی پھلکی سی ہوگی اور سب کچھ بھول بھال کر پہلے جیسی مصروف رہنے لگی۔ ہاں البتہ ایک شفیق ہستی تھی جو کہ شروع سے ہی اس سے ملنے کے لیے ہفتے میں تقریباً دو دفعہ آتی تھی۔ ان کے متعلق اماں نے بتایا تھا کہ وہ تمہارے دادا جان ہیں۔ وہ جب بھی آتے اس کے ساتھ ساتھ نائمہ اور زین کے لیے بھی ڈھیروں کپڑے اور کھلونے لاتے۔ وہ اکثر ہی ان کا انتظار کرتی کہ وہ اسے چاہتے بھی تو بہت تھے۔ وہ جب آتے وہ گھنٹوں ان سے باتیں کرتی رہتی اور پھر جب وہ تمام حقیقتوں سے واقف ہوئی تو انھوں نے بھی اسے سب کچھ سچ سچ بتا دیا اور پھر وہ ماں کے ساتھ ساتھ دودھیال سے بھی ایسی بددل ہوئی کہ کبھی ان سے ملنے کی خواہش دل میں بیدار نہ ہوئی۔
پھر شجاعت علی کو وفات کے بعد یہ دودھیال سے رابطہ ہمیشہ کے لیے منقطعہ ہوگیا۔

....

وہ خوشیوں کے جھولنے میں جھولتی پروان چڑھ رہی تھی۔ بابا کی آمدنی بہت زیادہ تو نہ تھی لیکن وہ پھر بھی اپنے بچوں کی ہر جائز خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتے۔

گھر چونکہ سرکاری تھا اس لیے اب ان کے دل میں اپنا گھر بنانے کی خواہش تھی۔ لیکن ابھی اتنی گنجائش نہ تھی کہ وہ اپنی اس خواہش کو کوئی عملی جامہ پہنا سکتے۔

خوشیوں بھرا یہ گھرانہ اپنی خوشیوں میں مگن تھا کہ نجانے کیا ہوا بابا اچانک بیمار رہنے لگے ہلکی ہلکی کھانسی تو انھیں اکثر ہی رہتی تھی۔ ڈاکٹر سے کے اصرار پر کبھی کبھی دوائی لے آتے۔ لیکن زیادہ توجہ نہ دی۔ لیکن جب مرض زیادہ بڑھ گیا تو ڈاکٹر نے مختلف ٹیسٹ کروانے کا مشورہ دیا۔ جسے وہ ٹال گئے کہ پہلے ہی دوائیوں پر اتنا خرچ ہو رہا تھا تو ان ٹیسٹوں کا خرچا ہی بہت تھا لیکن مرض تھا کہ دن بہ دن بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب انھیں ہسپتال لے جانا پڑا اور رپورٹیں بتا رہی تھیں کہ ٹی۔ بی کا مرض اپنے آخری اسٹیج پر پہنچ چکا تھا اور پھر ساری جمع پونجی خرچ ہوگئی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

تنوینہ ان دنوں بی۔ ایس سی کے فائنل ایئر میں تھی اور ایگزامز میں صرف چھ ماہ رہ گئے تھے لیکن اس کا زیادہ وقت بابا کے پاس ہی گزرتا تھا۔ وہ دن رات ان کی تیمارداری میں لگی رہتی۔ اور پھر ایک دن اس صبح وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ کوئی قیامت تھی جو ان پر بیت گئی تھی۔ بابا کیا گئے جیسے مصائب نے ان کا گھر دیکھ لیا۔ جمع پونجی تو پہلے ہی خرچ ہو چکی تھی گھر سرکاری تھا جو اب خالی کرنا تھا۔

''اب کہاں جائیں گے؟'' یہ سوالیہ نشان تھا جو سب کے ذہنوں میں گردش کرتا اور پھر ماموں نے اپنے گھر کا اوپر والا پورشن انھیں سر چھپانے کو دے دیا۔ جس کے صرف دو کمرے

تھے۔

ماموں کی بھی آمدن اتنی نہ تھی کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ ان کی کفالت بھی کرتے لہٰذا پیٹ پالنے کے لیے انھیں خود ہی کچھ کرنا تھا۔ سلائی کڑھائی کا کام تو اماں پہلے بھی کیا کرتی تھیں سو اب بھی کرنے لگیں۔ لیکن اس سے زندگی کی ضرورتیں پوری نہ ہوتیں تھیں۔

نائمہ جس نے آٹھویں کے پیپرز دیئے تھے اور زین جو پانچویں کا طالب علم تھا دونوں کی پڑھائی چھوٹ گئی۔ اور وہ خود بھی کالج نہیں جا رہی تھی۔ دن بہت کسمپرسی کے علام میں گزرنے لگے۔ ماموں کبھی کبھار تھوڑی بہت مدد کر لیا کرتے تھے۔

''آپا کیا تنوینہ کچھ نہیں کر سکتی۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی ہے۔'' یہ ممانی تھیں۔

''میرے ساتھ ہاتھ بٹاتی ہے کرتی ہی رہتی ہے کچھ نہ کچھ۔''

''اس طرح تھوڑا بہت کرنے سے کیا ہوگا۔ اس پر ذمہ داری ڈالو۔''

''ابھی بچی ہے بھابی اور ویسے بھی ابھی اس کے امتحان ہونے والے ہیں۔''

''آئے ہائے بچی ہے اس کی عمر کی لڑکیاں پورا پورا گھر سنبھالے ہوئے ہیں اور یہ ابھی بچی ہے۔'' ممانی بولتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

''بس اب مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوتا اماں۔'' وہ ایکدم ہی اماں کے سامنے کھڑی ہوگئی تو اماں حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

''بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے اب میں نوکری کروں گی۔''

''نوکری.....؟ لیکن تیرے امتحان؟''

''امتحان..... امتحانوں کے لیے بھی پیسے چاہئیں جو ہمارے پاس نہیں ہیں۔'' اس کے لہجے میں بھی آپ ہی آپ طنز عود آیا۔ اماں سوچتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''نہیں تنوینہ میں تیرا مستقبل اس طرح برباد نہیں ہونے دوں گی۔ تیرے بابا کو بہت شوق تھا تجھے بہت سا پڑھانے کا' دیکھ تو ایسا کر.....تو زرمینہ کے پاس چلی جا وہ تیری پڑھائی کا خرچہ اٹھا سکتی ہے۔'' اماں نے رک رک کر کہا۔

''اماں آج تو یہ بات کہی ہے آیندہ نہ کہنا۔'' وہ ایکدم بھڑک اٹھی۔

''میں اتنی خودغرض نہیں جوان حالات میں آپ کو تنہا چھوڑ جاؤں۔'' وہ یہ کہہ کر اٹھی اور اندر چلی گئی۔ لیکن اماں باز نہیں آئیں اور وقتاً فوقتاً اپنی بات دہراتی رہتیں اور اسے سمجھانے کی کوشش میں رہتیں۔ لیکن وہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹی تو اماں کو چپ ہونا پڑا۔ وہ بھی اس شرط پر کہ پہلے وہ اپنا فائنل کلیئر کرے پھر ملازمت کا سوچے۔

''لیکن اماں فیس کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا؟''

''اس کا بندوبست ہو جائے گا تو فکر نہ کر۔''

لیکن وہ کیسے فکر نہ کرتی یہ اسے گوارا نہیں تھا کہ اماں اس کی خاطر کسی کے آگے ہاتھ پھلائیں لہٰذا اس نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ ٹویشنز پڑھانا شروع کر دی۔ حالات کی وجہ سے وہ اس سال ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکی تھی۔ اس لیے اسے سخت محنت کرنا پڑی۔

خدا خدا کر کے ایگزامز سے فارغ ہوئی تو بہت سی فکریں دامن گیر تھیں۔ نائمہ اور زین کا سال ضائع ہو چکا تھا۔ اور پھر اس نے جاب کی تلاش میں کمر باندھ لی۔ لیکن جہاں بھی جاتی ناکامی اسے منہ چڑھا رہی ہوتی۔ اور اگر سیٹ ہوتی بھی تو یہ کہہ کر ریجیکٹ کر دیا جاتا کہ ''ہمیں

تجربہ کار لیڈی ورکر چاہیے۔'' یا پھر اسے ہی دفتری ماحول پسند نہ آتا کہ بہت سے کالے بھیڑیئے منہ کھولے ہوئے محسوس ہوتے اور اپنی عزت اسے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی۔

نوکری کی تلاش میں پھرتے پھرتے اس کی ٹانگیں شل ہو گئیں تھیں۔ کئی کئی گھنٹے وہ پیدل چلتی رہی کہ ویگنوں کے کرائے کے لیے پیسے کہاں سے لاتی۔ کوئی سفارش بھی تو نہ تھی جس کے ذریعے وہ کچھ حاصل کر سکتی۔ جو بھی کرنا تھا اسے خود ہی کرنا تھا۔ اچانک ہی اخبار میں اسے ایک اشتہار نظر آیا۔ کسی کمپنی کی طرف سے تھا جو کہ اپنی نئی برانچ کھول رہی تھی۔ اور اس کے لیے نوجوان ٹیلنٹ کی ضرورت تھی۔ تجربہ کاری کا مطالبہ نہیں تھا بلکہ لکھا تھا تجربہ ہم دیں گے۔

اس نے فوراً ہی ایڈریس اور فون نمبر نوٹ کر لیا۔ کیونکہ اشتہار میں یہ بھی امید دلائی گئی تھی کہ ''قابل اور ضرورت مند خواتین و حضرات کو ترجیح دی جائے گی۔''

.....

''جی بی بی تشریف رکھئے۔'' کمرے میں دو افراد موجود تھے۔ ادھیڑ عمر آدمی اس سے مخاطب ہوا۔

''سب سے پہلے تو آپ یہ بتائیں کہ آپ یہ جاب کسی ضرورت کے تحت کرنا چاہتی ہیں یا وقت گزاری کے لیے۔'' اسے یہ سوال بالکل فضول لگا کیونکہ اس کا لباس و انداز چیخ چیخ کر اس کے ضرورت مند ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔

''سر ہمارے ہاں کی عورت بنا ضرورت گھر سے نہیں نکلتی اور رہی بات وقت گزاری کی تو ہمارے طبقے کے لوگ وقت نہیں گزارتے بلکہ وقت انھیں گزارا تا ہے۔'' اس کے لہجے میں اعتماد کی جھلک موجود تھی۔

''ہوں' اچھا آپ یہ بتائیں کیا نام ہے آپ کا؟'' انھوں نے اگلا سوال پوچھنے سے پہلے نام پوچھ لینا مناسب سمجھا اور ساتھ ہی وہ اس کی فائل کھول کر دیکھنے لگے۔

''تنویہ حیدر۔'' اس نے بتایا تو وہ سر اٹھا کہ اس کی طرف دیکھنے لگے ان کی آنکھوں میں تھوڑی سی الجھن تھی۔

''والد کا نام؟''

''حیدر علی خان۔'' اس کے بتانے پر ان کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں نمودار ہوئیں۔

''دادا کا نام؟'' اسے یہ سوالات بالکل غیر ضروری اور بچگانہ سے لگ رہے تھے۔ کیونکہ یہ سب کچھ اس کی فائل میں درج تھا لیکن وہ فائل دیکھ کہاں رہے تھے وہ تو بغور اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس نے کچھ الجھے سے لہجے میں جواب دیا۔

''شجاعت علی خان۔''

''ہوں۔ اب ایک اور پرسنل سوال۔''

انھوں نے کہا تو وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی جبکہ ان کے ساتھ بیٹھے شخص کے چہرے پر بھی الجھن و بیزاری کے تاثرات واضح تھے۔

''یہ جاب آپ کیوں کرنا چاہتی ہیں آپ کے گھر .....والد.....؟' انھوں نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''والد کا انتقال ہو چکا ہے اور ایک بھائی ہے جو کہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔'' اس نے جواب دیا تو انھوں نے اس کی فائل پر سرسری سی نگاہ ڈال کر ٹیبل پر اس کے آگے سرکا دی۔

''ٹھیک ہے بیٹی یہ ادارہ کھولا ہی آپ جیسے ضرورت مند لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کے لیے ہے۔ آپ اطمینان سے گھر جائیں اور اپائنٹمنٹ لیٹر کا انتظار کریں۔''

''تھینک یو سر۔'' اس نے فائل اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر کمرے سے باہر آ گئی۔

اور پھر اسے اپائنمنٹ لیٹر کا زیادہ دن انتظار نہیں کرنا پڑا۔ امید تو پوری تھی کہ جاب مل جائے گی لیکن یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ اسے اتنی بڑی سیٹ دی جائے گی۔ وہ کمپنی کے میجنگ ڈائریکٹر کی اسسٹنٹ بنائی گئی تھی۔ ایم۔ڈی کے بعد زیادہ تر اختیارات اس کے پاس ہونا تھے۔

اگلے دن جب وہ وہاں پہنچے تو کامن روم میں پہلے سے ہی پانچ افراد موجود تھے۔ جن میں سے لڑکی صرف ایک ہی تھی وہ بھی اس کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی۔ ابھی وہ کمرے اور ماحول کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ اس دن والے دونوں حضرات کمرے میں داخل ہوئے۔

''السلام علیکم۔'' ادھیڑ عمر آدمی نے پہل کی تو کمرے میں موجود سب لوگ کھڑے ہو گئے۔

''تشریف رکھئے میرا خیال ہے کہ ہمیں پہلے ایک دوسرے سے تعارف حاصل کر لینا چاہیے۔'' انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیڈیز فرسٹ۔'' انھوں نے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔

''تانیہ جلیل' تنویہ حیدر۔'' سب نے باری باری نام بتائے تو انھوں نے اپنا بھی تعارف کرایا۔

''مجھے منصور احمد کہتے ہیں' اور یہ ہیں ہماری کمپنی کے میجنگ ڈائریکٹر ارسل منصور۔'' انھوں نے کہا تو اس نے سر ہلا کر تائید کی۔ باقی سب کے ساتھ وہ بھی اس کی طرف دیکھنے لگی جس کی وہ اسسٹنٹ بنائی گئی تھی۔ چہرے سے تو وہ خاصا بااصول اور ریزروسا انسان لگتا تھا۔

''ناموں سے تو کہا آپ فیس سے ہی اندازہ کر چکے ہوں گے کہ انھیں میرے صاحب زادے ہونے کا شرف حاصل ہے۔'' منصور صاحب خاصے خوش اخلاق تھے ان کی بات پر سب مسکرا دیئے۔

''لیکن صرف گھر تک۔ یہاں یہ ابھی صرف آپ لوگوں کی طرح ورکر ہیں۔'' وہ سنجیدہ ہوئے۔

''کیونکہ آپ ہی کی طرح یہ بھی بزنس کی دنیا میں ابھی نووارد ہیں اس لیے اس کمپنی کو فی الحال میں ہی مینج کروں گا۔ آپ لوگوں کا انتخاب چونکہ میرٹ پر ہوا ہے اس لیے آپ کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں۔ جبکہ ابھی ہمیں بہت سے چھوٹے ورکرز کی ضرورت ہے کچھ تو سلیکٹ ہو چکے ہیں اور باقی آپ لوگ لائیں گے۔'' انھوں نے کہا تو تنویہ کے ذہن میں کئی ایک ایسی لڑکیاں آئیں جنھیں جاب کی ضرورت تو تھی لیکن وہ کم پڑھی لکھی تھیں اور پھر وہ ان کو دیگر تفصیلات سمجھانے لگے اور اس طرح پہلا دن تو تعارف کرنا' کام کو سمجھنے میں گزرا۔

اگلے دن وہ سب ٹائم پر پہنچ گئے اس کے اور تانیہ کے لیے علیحدہ کمرے میں چیئرز اور ٹیبل سجائی گئیں تھیں۔ باقی لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام درمیان والے کمرے میں تھا جبکہ تمام چھوٹے ورکرز کے لیے ہال کمرے کا انتخاب کا گیا تھا۔

کام شروع ہونے سے پہلے ایم۔ڈی صاحب نے ان کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔

''لیڈیز اینڈ جینٹس جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہماری کمپنی نے بالکل نیا نیا کام شروع کیا ہے بظاہر تو یہ پاپا ہی کی کمپنی کی ایک برانچ ہے لیکن ہم نے اپنی کوششوں اور محنتوں سے اسے ایک علیحدہ مقام دینا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد ایک اچھے اور اونچے مقام پر پہنچانا ہے۔'' اس نے کہا تو سب نے انشاءاللہ کہا۔

''اور اس کے لیے مجھے آپ لوگوں کا تعاون درکار ہوگا۔ چونکہ آپ سب کی طرح میں بھی اس فیلڈ میں نیا ہوں اس لیے فی الحال پاپا ہی اس کے ڈائریکٹر ہیں، لہٰذا تو میں نے ان کے

ساتھ رہتے ہوئے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن اپنے جوہر آزمانے کا مجھے اب ہی موقع ملا ہے۔ اس وقت یہاں موجود سب لوگ برابر ہیں میرا مطلب ہے کوئی افسر یا ماتحت نہیں ہے بلکہ یہاں ہر ایک کو اپنی جگہ خود بنانا ہے۔ جو کوئی جتنی محنت کرے گا وہی سیٹ کا مستحق ہوگا۔'' وہ اٹھ کر اپنی چیئر کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور دونوں بازو اس کی پشت پر رکھ دیئے۔

''اور اگر کوئی اپنے کام سے انصاف نہ کر سک اور ہمارے معیار پر پورا نہ اتر سکا تو یقیناً اس سے وہ سیٹ واپس لے لی جائے گی۔ جس کے لیے اسے منتخب کیا گیا ہے۔'' اور یہ کہتے ہوئے اس کی نظر بالکل غیر ارادی طور پر تنویہ حیدر پر پڑی۔ کیونکہ ان سب میں وہ واحد تھی جس کے لیے سیٹ کا انتخاب ہوا تھا۔ اور وہ جو اس کی طرف دیکھتے ہوئے پورے انہماک اور توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی اس طرح اچانک اس کے دیکھنے پر پلکیں جھکا گئی۔ اور شاید ارسل منصور کے لیے یہی ایک کمزور لمحہ تھا۔

''اور جہاں تک میرا خیال ہے آپ لوگ ہمیں مایوس نہیں کریں گے اور اس بات کا احساس نہیں دلائیں گے کہ ہم نے آپ کا انتخاب غلط کیا۔'' اس نے فوراً ہی خود کو سنبھالا۔

''انشاء اللہ سر۔'' سب نے ایک ساتھ کہا۔

''سو کانڈز آف یو اینڈ گڈ لک۔''

پھر جہاں تانیہ اور تنویہ کمپنی کے سرگرم رکن بنے وہاں باقی لوگ بھی کمپنی کا اہم ستون ثابت ہوئے۔ کچھ ہی دنوں میں ان میں دو نئی لڑکیوں فریحہ اور راحیلہ کا اضافہ ہوگیا۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی تگ و دو میں بہتر نتائج سامنے لانے کی کوشش کرتا۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس نے بھی اپنے کام میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ منصور صاحب نے اسے بہت گائیڈ کیا تھا۔ لیکن ایک وہ تھا کہ جس سے اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر ہمیشہ ڈانٹ کھانا پڑی۔ وہ اس کی غلطی کو کبھی معاف نہیں کرتا تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی غلطی پر بھی اسے بے عزت کرے کے رکھ دیتا۔ شروع شروع میں تو وہ اپنی غلطیاں ہونے کے باعث شرمندہ سی سب کچھ سنتی رہتی تھی۔ لیکن پھر بہ جلد ہی اس نے خود کو امپروو کر لیا۔ وہ اپنا کام بڑی محنت اور دیانت داری سے کرتی۔ منصور صاحب ہمیشہ اس کے کام کی تعریف کرنے اس کی محنت کو سراہتے تھے۔

''شاباش بیٹا آپ نے مجھے مایوس نہیں کیا اور مجھے خوشی ہے کہ میں نے آپ کا انتخاب غلط نہیں کیا تھا۔ حالانکہ ارسل کا خیال تھا کہ ایک بالکل ناتجربہ کار لڑکی اس سیٹ کے لیے موزوں نہیں۔''

''سر وہ تو ابھی بھی میرے کام سے مطمئن نہیں ہیں۔''

''کوئی بات نہیں آہستہ آہستہ ہو جائے گا۔'' لیکن شاید یہ خام خیالی ہی تھی۔

''مس تنویہ میرے کمرے میں تشریف لائیں۔'' انٹر کام پر کہا گیا۔

''جی اچھا سر۔'' لیکن وہ کوئی فائل دیکھ رہی تھی جسے کمپلیٹ کر کے اس کے پاس لے جانا چاہتی تھی اس لیے تھوڑی دیر ہوگئی۔ اور جب وہاں پہنچی تو صورتحال غیر متوقع تھی۔

''مس تنویہ میں آپ کا ملازم نہیں ہوں جو بیٹھا آپ کا انتظار کرتا رہوں۔'' اس کا سخت اور کھردرا لہجہ غصے سے بھرپور تھا۔

''سر میں یہ..... وہ ... فائل۔'' وہ لڑکھڑا گئی۔

''شٹ اپ۔'' اس نے کہا اور ہاتھ میں پکڑا کاغذ اس کی طرف اچھال دیا۔

''یہ لیٹر آپ نے ٹائپ کیا ہے؟''
''نہیں سر۔'' تانیہ نے کہا' وہ سمجھتے ہوئے انداز میں بولی۔
''لے جائیں اسے اور اچھی طرح چیک کر کے لائیں میرے پاس۔''
''سر یہ فائل؟'' اس نے سہمے ہوئے انداز میں پوچھا۔
''میرے سر میں مارو اسے۔'' شاید بہت الجھا ہوا تھا اس لیے یوں کہہ دیا تھا وہ چپ کھڑی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ چلی جائے یا فائل کھول کر اس کے سامنے رکھ دے۔
''اب کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہیں؟''
''سر یہ فائل بہت امپورٹنٹ ہے۔'' وہ بولی۔
''فائل..... فائل کیا بکواس ہے یہ؟'' وہ آگ بگولا ہو گیا اٹھ کر اس کے قریب آیا اور فائل چھین کر میز پر پٹخ دی۔
''اب جاؤ یہاں سے۔'' اس نے دھتکارنے والے لہجے میں کہا۔
''سر آخر میرا قصور کیا ہے؟'' کئی دنوں سے مچلتا سوال آج آخر زبان پر آ ہی گیا۔ اور وہ جو پلٹ گیا تھا مڑ کر دوبارہ اسے گھورنے لگا۔
''میں فضول سوالات سننے کا عادی نہیں ہوں۔'' اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔
احساس تذلیل اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو ضبط کرتی وہ اپنی سیٹ پر آ گئی۔
''لگتا ہے ڈوز ملی ہے۔'' تانیہ نے مسکرا کر چھیڑا تو ضبط کے باوجود بھی آنسو رواں ہو گئے۔
''کم آن یار بیوقوف ہوا گنور کر دیا کرو۔'' لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔
تھوڑی دیر بعد منصور صاحب ان کے کمرے میں آ گئے اور مختلف سوالات کرنے لگے جن کا جواب تانیہ ہی دے رہی تھی۔ اس بات کو انھوں نے بہت جلد نوٹ کیا۔
''کیا بات ہے بیٹا خیریت؟'' انھوں نے پوچھا لیکن وہ کچھ بھی نہ بول سکی۔
''تنویہ بیٹا کوئی پریشانی ہے کیا؟'' وہ ہمدردی سے پوچھ رہے تھے۔
''نو سر۔'' کوشش کے باوجود بھی لہجے میں نمی تھی۔
''کم آن مائی چائلڈ بتاؤ کیا پرابلم ہے؟'' انھوں نے نہایت محبت سے پوچھا تو اس کے روکے ہوئے آنسو ایک بار پھر ابل پڑے۔
''وہ سر..... شاید ارسل صاحب نے کچھ کہا ہے۔'' اس کے رونے کے دوران تانیہ نے بتایا۔
''اوہو بھئی اتنی سی بات پر رو رہی ہو میں تو آپ کو بہت بہادر سمجھتا تھا۔''
''اچھا چلو بتاؤ کیا کہا ہے ارسل نے؟''
''سر انھیں میرا کام پسند نہیں آتا۔ بلاوجہ ہی ڈانٹتے رہتے ہیں۔'' اس نے ناک رگڑتے ہوئے معصومیت سے بتایا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔
''بس یا کچھ اور بھی؟'' وہ خاموش رہی اب کیا بتاتی کہ وہ اس کی کتنی تذلیل کرتا ہے۔
''ٹھیک ہے اب میں اسے سمجھا دوں گا کہ وہ میری بیٹی کو کچھ نہ کہا کرے۔'' انھوں نے کہا تو اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا کہ نجانے اب وہ کس طرح اسے اپنے عتاب کا نشانہ بنائے گا۔
اور پھر اس کے خدشات صحیح ثابت ہوئے۔ اگلے دن وہ اسے اپنے کمرے میں بلانے کی بجائے ان کے کمرے میں ہی چلا آیا۔ اور تانیہ سے باتیں کرنے لگا۔ وہ اپنے کام میں اتنی منہمک تھی کہ اسے خبر ہی نہ ہوئی۔
''مس تانیہ سنا ہے کچھ لوگوں کو شکایتیں

لگانے کی بہت عادت ہے؟'' وہ قدرے بلند آواز میں بولا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ اسے غصے سے گھورنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا فون کی بیل نے متوجہ کر لیا۔

''سر آپ کا فون ہے۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''اسے میرے کمرے میں ملائیں اور آپ خود بھی تشریف لائیں ذرا۔'' وہ کہتا ہوا اٹھ کر باہر نکل گیا اور وہ اس کی لمبی چوڑی پشت کو گھور کر رہ گئی۔

''اب جاؤ بھی یا ابھی اور شامت بلوانے کا ارادہ ہے؟'' تانیہ نے شرارت سے کہا۔

''آخر تمہیں کیا ضرورت تھی منصور صاحب کو سب کچھ بتانے کی؟''

''ارے اب ادھر کا غصہ ادھر تو مت نکالو۔'' اس نے اسے کہا تو وہ کھا جانے والی نظروں سے گھورتی نکل گئی۔

زرد ہوتی رنگت اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ ریسیور رکھ رہا تھا۔

''بیٹھو۔'' وہ خاموش بیٹھی لب کاٹتی اور ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملتی رہی۔ اور وہ بغور اس کی کیفیت جانچنے لگا۔ بہت سے لمحے خاموشی کی نظر ہو گئے۔

''میں جاؤں سر؟'' اسے اس کی نظروں سے الجھن ہونے لگی تو بول اٹھی کہ یہ تو ڈانٹ کھانے سے بھی زیادہ سخت امتحان تھا۔

''کیوں؟'' اس کا لہجہ و انداز کھویا کھویا تھا وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھے کام کرنا ہے۔''

''بیٹھ جاؤ تنویہ حیدر۔'' لیکن وہ کھڑی رہی تو وہ اٹھ کر اس سے تھوڑے فاصلے پر آ کھڑا ہوا۔

''کیا بتایا تھا پاپا کو میرے متعلق؟'' ایکدم سے ہی انداز تفتیشی ہو گیا۔

''مم..... میں نے کچھ نہیں بتایا وہ تو تانیہ نے کہا تھا۔''

''کیا.....؟'' وہ ابھی تک اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑھے ہوئے تھا۔ اور اب اس کی ٹانگوں میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ کھڑی رہتی۔ سو دوبارہ بیٹھ گئی تو وہ بھی میز کے کونے پر ٹک گیا۔

''تنویہ حیدر ایک بات بتاؤ سچ سچ۔'' اس نے مشکوک سے لہجے میں کہا تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگی لیکن جلد ہی نظر جھکا لیں۔

''آخر تم کس مقصد کے لیے یہاں آئی ہو؟'' اس کا لہجہ شک سے بھرپور تھا۔ وہ حیرت سے اسے تکنے لگی۔

''پاپا کو تو تم نے پہلے ہی دن شیشے میں اتار لیا تھا اور اب میری شکایتیں لگا کر مجھے ٹریپ کرنا چاہتی ہو۔'' اس کے لہجے میں حقارت عود آئی۔

اتنی تذلیل، اتنی ذلت، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''میر..... سر آپ؟'' وہ ضبط کی حدوں سے گزر رہی تھی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ اس سامنے بیٹھے شخص کا چہرہ تھپڑوں سے لال کر دے وہ جھٹکے سے اٹھی اور تیزی سے باہر نکلتی چلی گئی۔

.....

آج انھیں اس ادارے سے وابستہ ہوئے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔ لیکن اس کا رویہ بدستور تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اسے کے ساتھ اتنا تضحیک میز سلوک کرتا کہ اس کا دل چاہتا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں سے چلی جائے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی کہ اب گھریلو حالات بمشکل قابو آئے تھے۔ نائمہ اور زین پھر سے سکول جانے لگے تھے۔ روٹی کپڑے کی فکر کم ہو گئی تھی۔

دوسری وجہ خود منصور صاحب تھے جو اسے بیٹیوں کی طرح چاہتے تھے۔ یہاں سب لوگ اس بات سے واقف تھے کہ منصور صاحب یوں تو سب کے ساتھ ہی بہت اچھی طرح پیش آتے تھے لیکن تنوینہ کو خصوصی توجہ و اہمیت دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دفتر کا سارا عملہ بھی اس کی بے حد عزت کرتا تھا۔ بس ایک رئیس احمد صاحب تھے جن کے دل میں دنیا بھر کی حسیناؤں کا درد چھپا تھا۔ وہ ہر لڑکی کی تعریف کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اور آج کل تو وہ اس کی نظر کرم سے منتظر رہتے تھے۔ آتے جاتے اس پر تعریفی کلمات اور ذو معنی جملے اچھالتے جنھیں وہ مسکرا کر ٹال جاتی تھی۔

.....

مہینے کے آخری دن تھے منتھلی میٹنگ ہونے والی تھی۔ اور ہر کوئی اپنی بہتر کارکردگی دکھانے کی کوشش میں جتا ہوا تھا۔ یوں تو یہاں ہر وقت ہی کام ہوتا تھا لیکن آخری دنوں میں ہر کسی کے لیے ایک ایک منٹ قیمتی ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کمپنی نے اتنے کم وقت میں بہت اچھا مقام حاصل کر لیا تھا۔ اب تو منصور صاحب بہت کم یہاں آتے تھے زیادہ تر صرف میٹنگز میں ہی شرکت کرتے۔ اب سارا کنٹرول ارسل منصور کے ہی پاس تھا۔ ہال کے تمام ورکرز تنوینہ اور تانیہ کے ماتحت تھے جبکہ تنویر باقی سٹاف کو کور کرتا تھا چونکہ آج میٹنگ تھی اس لیے سب لوگ جمع تھے۔ منصور صاحب کے آتے ہی کارروائی شروع ہوگئی۔

''محترم ساتھیوں آپ لوگوں نے اس کمپنی کی ترقی کے لیے جس طرح دن رات محنت کی ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ آپ لوگوں کے خلوص کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کی محنتوں کا معاوضہ آپ لوگوں کو بہت کم دیا گیا کہ یہ کمپنی کی مجبوری تھی۔ لیکن اب میں یہ بات کہتے ہوئے بہت خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ اب ہماری کمپنی اس قابل ہے کہ اپنے ورکرز کو ان کی محنتوں کا پورا معاوضہ دے۔ اور انشاء اللہ سال کے شروع میں ہم تنخواہوں کا نیا بجٹ بنائیں گے۔

منصور صاحب نے اپنے پروقار لہجے میں بات کرتے ہوئے انھیں خوشخبری سنائی اور پھر سب نے اپنے اپنے کام کے حوالے سے مختلف رپورٹیں انھیں دکھائیں۔

''ویلڈن بہت خوب تنوینہ بیٹا آپ نے تو کمال کر دیا۔ ان رپورٹس میں آپ نے جو لائحہ عمل تیار کیا ہے یہ آگے چل کر اس کمپنی کو بہت فائدہ دے گا۔ بہت خوب۔'' منصور صاحب دل کھول کر تعریف کر رہے تھے۔

''لو بھئی ارسل تم بغور ان کا مطالعہ کرو۔ اور جلد از جلد ان پر اجیکٹس پر کام شروع کر دو۔ میرے پاس تو اتنی فرصت نہیں ہے کہ میں یہاں ٹائم دے سکوں۔ آج کل فیکٹری کے حالات کچھ گربڑ سے ہیں۔ بہرحال تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں اتنا ذہین اور اچھا سٹاف ملا ہے۔'' منصور صاحب جن رپورٹس کی اتنی تعریف کر رہے تھے اس نے ان پر سرسری سی نظر ڈال کر ایک سائیڈ پر رکھ دیں۔

''تنوینہ بیٹا آپ کو اگر کوئی مسئلہ ہو کسی بھی قسم کی کوئی پرابلم ہو تو مجھے ضرور بتائیں جہاں تک بھی ہو سکا میں آپ کی ہیلپ کروں گا۔'' وہ اس وقت اس کے کمرے میں ہی بیٹھے تھے۔

''نو سر کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' اس سے مسکرا کر کہا۔

''نہیں جھجکنے کی بات نہیں ہے بیٹا میں آپ کو بیٹی کہتا ہی نہیں سمجھتا بھی ہوں۔ تم بنا جھجکے ہر بات مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔'' یہ کہتے ہوئے ان کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔

''اس طرح ہو سکتا ہے کہ شاید میرے اندر

کا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔'' وہ ایکدم ہی ملول ہوگئے۔

''سر کیسا بوجھ؟''

''بیٹی نہ ہونے کا بوجھ۔'' انھوں نے مسکرا کر ٹالا۔

''لیکن تمہیں دیکھ کر سوچتا ہوں کہ بیٹی ہو تو ایسی۔''

''سر آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں۔'' اس نے جھینپتے ہوئے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

''وہ سر..... ایک پرابلم ہے تو سہی۔'' وہ پھر جھجک گئی۔

''سر اگر پک اینڈ ڈراپ کے لیے کنوینس کا مسئلہ حل ہو جاتا تو بہتر ہے تو دفتر کی باقی لڑکیاں بھی یہ مطالبہ کر رہی ہیں سر۔''

''ہاں بالکل ابھی میں کل ارسل سے کہہ رہا تھا کہ دفتر میں لڑکیاں زیادہ ہو گئیں ہیں اب کمپنی کی طرف سے انھیں پک اینڈ ڈراپ کی سہولت ملنی چاہیے۔''

''لیکن تم عام ورکرز کے ساتھ وین میں نہیں جاؤ گی بلکہ تمہارے لیے علیحدہ گاڑی ہونی چاہیے۔''

''نو سر میرے لیے یہی کافی ہے پبلک ٹرانسپورٹ پر دھکے کھانے سے بہت بہتر ہے۔''

''خیر دیکھتے ہیں' او کے میں چلتا ہوں۔ وش یو بیسٹ آف لک اینڈ سی یو اگین۔''

''تھینک یو سر۔'' وہ بھی مسکرائی۔

اور یہ مسئلہ حل ہوتے ہی بہت سی لڑکیاں اس کے پاس شکریہ ادا کرنے کے لیے آئیں۔ ان کا ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہوگیا تھا۔ لیکن اس کے لیے واقعی علیحدہ سے گاڑی اور ڈرائیور کا بندوبست ہوا تھا۔

''مس تنوینہ اب تو آپ کے پاس لیٹ ہونے کا کوئی جواز نہ ہوگا۔'' ارسل منصور نے بڑے چبھتے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

''انشاء اللہ سر اب میں لیٹ نہیں ہوں گی۔''

اب وہ خاصی پراعتماد ہوگئی تھی۔ اب وہ اس کے ڈانٹنے پر نہ تو روتی تھی اور نہ ہی پریشان ہوتی۔ بلکہ اب وہ اسے اس کی عادت سمجھ کر اگنور کر جاتی جس سے وہ چڑ جاتا اسے اس کا یہ اعتماد ایک آنکھ نہ بھاتا تھا اور بلاوجہ ہی اس سے الجھ پڑتا۔

زندگی اب کچھ پرسکون ہوگئی تھی شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ انسان کے اپنے اندر سکون ہو تو اسے ہر چیز پرسکون نظر آتی ہے۔ اب وہ سنجیدگی سے علیحدہ گھر لینے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جبکہ اماں کا یہ مطالبہ بڑھتا جا رہا تھا کہ اب وہ شادی کے لیے رضامند ہو جائے۔ لیکن وہ ابھی ایسا نہیں چاہتی تھی کہ ابھی اسے بہت کچھ کرنا تھا۔ بہت سے قرض اتارنا تھے اور پھر اس وقت تک تو وہ شادی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی تھی جب تک زین کسی قابل نہ ہو جاتا اور ابھی تو وہ بمشکل میٹرک تک ہی پہنچا تھا۔

اور ادھر روز بروز ممانی کا مطالبہ بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ علیحدہ گھر کا انتظام کریں کیونکہ انھیں بہو لانے کی جلدی تھی۔ اور اماں تو اب ہر وقت یہی گلہ کرتی نظر آتی تھیں کہ بھابی باہر سے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں کیا انھیں گھر میں جوان لڑکی نظر نہیں آتی۔

.....

''تنویر بیٹا۔''

''یس سر۔''

''اوں ہوں اب تم مجھے سر مت کہا کرو انکل بلکہ پاپا کہو تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔ کیونکہ اب میرا اس دفتر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا۔''

''سر..... پاپا۔'' وہ یہ کہہ کر ہنس دی۔

''نو سر انکل ہی ٹھیک ہے پاپا کہوں تو ارسل صاحب برداشت نہیں کر سکیں گے۔'' وہ مسکرا کر کہہ گئی۔

''چلو جیسے تمہاری مرضی لیکن اب سرور نہیں چلے گا۔ ہاں تو ڈرائیور بتا رہا تھا کہ وہ تمہیں سٹاپ سے پک کرتا ہے کیونکہ گاڑی اندر گلیوں میں نہیں جا سکتی۔''

''یس سر۔'' وہ خفیف سی بولی۔

''کہاں ہے آپ کا گھر؟''

''سر میرا گھر نہیں ماموں کا گھر۔'' وہ سنجیدہ ہوگئی۔

''بابا کے ہوتے ہوئے سرکاری گھر میں رہتے تھے ہم لوگ پھر ماموں کے گھر آ گئے۔''

''اس فضول جگہ پر رہتے ہو آپ۔'' وہ بے اختیار کہہ گئے۔

''جی سر کیا آپ نے دیکھا ہے؟'' اس نے کہا تو گڑبڑا گئے۔

''آں نہیں میرا مطلب ہے ایسی جگہ پر رہتے ہو جہاں گاڑی بھی نہ جا سکے۔''

''مجبوری ہے سر لیکن شکر ہے اللہ کا اگر وہ بھی نہ ہوتا تو کہاں جاتے۔''

''ہوں ٹھیک ہے تم فکر نہیں کرو۔''

اور پھر چند ہی دن بعد انھوں نے اس کے ہاتھ میں چابیاں پکڑا دیں۔

''یہ کیا ہے سر؟''

''سر نہیں انکل۔''

''او عادت ہوگئی ہے سر۔ اب چھوٹتے ہوئے ہی چھٹے گی ناں۔'' اس نے کہا اور پھر ''سر'' کہنے پر ہنس دی۔

''بہرحال یہ آپ کے گھر کی چابیاں ہیں جو آپ کو کمپنی کی طرف سے الاٹ ہوا ہے۔''

''انکل اگر یہ گھر کمپنی کی طرف سے ہوتا تو یہ چابیاں مجھے ارسل صاحب دیتے۔'' اس کے لہجے میں تھوڑی سی بے بسی اور کچھ تشکر تھا۔

''کم آن سویٹ گرل۔ اتنا ڈس ہارٹ مت رہا کرو۔''

''انکل میں آپ کی کن کن نوازشات کا شکریہ ادا کروں؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''نو بالکل نہیں میں نے کوئی احسان نہیں کیا تم پر بلکہ یہ تمہارا حق ہے۔'' انھوں نے کہا تو وہ انھیں دیکھنے لگی۔

''بس بیٹا آپ میرے لیے دعا کیا کرو کہ خدا مجھے پچھتاووں کے بھنور سے نکال دے۔''

''انکل آپ مجھے بیٹی بھی کہتے ہیں اور اپنے دل کا بوجھ بھی ہلکا نہیں کرتے۔ انکل آج کہہ دیں ہو سکتا ہے اس طرح کچھ سکون مل جائے آپ کو۔''

''کہوں گا وقت آنے پر اپنے تمام کوتاہیوں کا اقرار کروں گا لیکن ابھی تو مجھے ان زیادتیوں کا کفارہ ادا کرنا ہے۔'' انھوں نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا تو وہ چپ چاپ کمرے سے نکل آئی۔

.....

فرنیچر اور آلائشی چیزوں سے آراستہ و پیراستہ یہ گھر نائمہ اور زین کو بہت پسند آیا تھا۔ اور وہ اپنی خوشی کا اظہار نعروں اور مختلف پلانگز بنا کر کر رہے تھے بچوں کو خوش دیکھ کر اماں بھی خوش تھیں۔ اور ان سب کو خوش دیکھ کر وہ بھی خوش ہوگئی۔ اسے لگا جیسے تمام فکریں ختم ہوگئیں ہیں۔ سارا سٹاف گھر ملنے کی خوشی میں اس سے ٹریٹ مانگ رہا تھا۔ اور وہ گھر میں ہی پارٹی ارینج کرنا چاہتی تھی۔ لیکن منصور صاحب نے مصروفیت کا بہانہ کر کے آنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور ارسل سے وہ کوئی توقع نہیں رکھ سکتی تھی۔ لہذا دفتر میں یہ لنچ بریک ٹائم میں چھوٹی سی پارٹی کا انتظام کر لیا۔

جس میں منصور صاحب بھی شریک ہو سکتے تھے۔
اس وقت وہ سب لوگ کامن روم میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور ساتھ ساتھ خوش گپیاں بھی جاری تھیں۔ منصور صاحب تو کھانا کھاتے ہی چلے گئے تھے اور ارسل بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ گیا تھا۔
''سڑیل۔'' وہ دل ہی دل میں کہہ گئی لیکن تانیہ بول اٹھی۔
''بھلا ان جناب کو مکھیاں مارنا ہیں آفس میں بیٹھ کر۔''
''لو بھئی افسرانہ رعب تو جمانا ہے نا۔''
''اگر ہم میں مل بیٹھیں تو پتا کیسے چلے گا کہ باس کون ہے۔'' سب کی رائے مختلف تھی لیکن اس کے لب خاموش تھے۔
''بی بی جی میری طرف سے بھی آپ کو بہت بہت مبارک ہو جی۔'' یہ رحمت تھا اس دفتر کا چپڑاسی جس سے وہ ہمیشہ خوش دلی سے ایس کا اور اس کے بیوی بچوں کا حال چال پوچھتی تھی۔ اور اکثر اوقات حسب توفیق مالی مدد بھی کر دیا کرتی۔ رحمت بے حد سادہ دل اور شریف انسان تھا۔ اس لیے وہ اس کی قدر کرتی تھی۔ اور وہ بھی اس کا بے حد احترام کرتا۔
''یہ کیا بات ہوئی رحمت تم یہاں سب لڑکیوں کے نام لیتے ہو۔ تانیہ باجی' فریحہ باجی' راحیلہ باجی اور تنویہ کو صرف بی بی جی ایسا لگتا ہے جیسے کسی بڑی بی کو پکار رہے ہو۔''
''وہ جی بات یہ ہے تانیہ باجی کہ بی بی جی کا نام مجھے بہت مشکل لگتا ہے۔ اس لیے صرف بی بی جی کہہ لیتا ہوں۔'' اس نے قدرے شرمائے ہوئے لہجے میں جواب دیا تو اس کے انداز پر سب لوگ ہنس دیے۔
''ارے رحمت بھائی اگر آپ کو تنویہ کہنا مشکل لگتا ہے تو آپ مجھے وینہ کہہ لیا کریں یہ تو آسان ہے ناں۔''
''وینہ بی بی ہاں جی یہ ٹھیک ہے۔'' وہ زیر لب دہرا کر بول اٹھا۔
''آہاہ کاش کہ میں بھی ایک چپڑاسی ہوتا۔'' یہ رئیس صاحب نے سینے پر ہاتھ رکھ کر گہری سانس لیتے ہوئے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی۔
''محترم اس میں اس قدر پریشانی کی کیا بات ہے؟ ہم ابھی آپ کی سفارش کر دیتے ہیں۔'' تنویر نے ان کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا تو ان کے برا سا منہ بنانے پر زوردار قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا۔

.....

''وینہ جی۔'' اس قدر بے تکلفی سے پکارنے پر اس نے جاتے جاتے پلٹ کر دیکھا۔ اس وقت سب لوگ لنچ کے لیے جا چکے تھے اور وہ بھی اسی غرض سے نکلی تھی کہ رئیس احمد نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے اسے پکار لیا۔ تو وہ بڑی بردباری سے ایک ایک قدم جماتی ہوئی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔
''اگر آج آپ لنچ میرے ساتھ کریں تو مجھے خوشی ہوگی۔'' ان کے لہجے میں لجاجت تھی۔
''رئیس احمد صاحب اگر میں آپ کی فضول قسم کی باتوں کو ہنس کر ٹال دیتی ہوں تو اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ میں نے آپ کو اس قدر بے تکلفی کی اجازت دی ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتی بول رہی تھی۔
''آئندہ مجھ سے بات کرنے سے پہلے ہزاروں بار سوچیے گا کہ آپ کیا کہنے جا رہے ہیں' انڈر سٹینڈ۔''
وہ کہہ رہی تھی جبکہ رئیس احمد کا رنگ اس کے پیچھے کہیں اور دیکھتے ہوئے سفید پڑ چکا تھا۔ وہ اپنی بات کہہ کر مڑی تو اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر

کھڑا ارسل انھیں ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک نظر اس پر ڈال کر اس کے قریب سے نکلتی چلی گئی۔ اس نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور پھر چند قدم بڑھا کر ان کے قریب آ گیا۔

''کیوں رئیس صاحب یہ کون سی جگہ ہے؟'' اس کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی تھی۔

''سر دفتر۔'' انھوں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''جی ہاں میں بھی آپ سے یہی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ دفتر ہے کوئی کلب نہیں کہ جہاں آپ لڑکیوں کو کھانے کی دعوتیں دیں۔ یہاں ہر لیڈی ورکر کی عزت کرنا ہمارا فرض ہے کیا خیال ہے میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نو سر۔'' انھوں نے جھکے سر سے جواب دیا۔

''او کے آیندہ ایسی حرکت نہ کیجیے گا ورنہ۔'' یہ کہتے ہوئے ہوئے ارسل بھی باہر نکل گیا۔

.....

''ویسے یہ رئیس احمد کون ہے؟'' وہ فائلیں کھولے بیٹھی تھی کہ اماں بھی اس کے قریب آن بیٹھی۔

''ہمارے کولیگ ہیں۔'' پہلے تو اس نے سرسری سا جواب اور پھر چونک کر سر اٹھایا۔

''کیوں آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔ کیسے جانتی ہیں آپ انھیں؟''

''بیٹا آج اس کی والدہ آئیں تھیں۔''

''اس کی والدہ..... وہ کیوں؟'' وہ حیرانگی سے پوچھنے لگی۔

''تمہارا رشتہ لے کر۔''

''کیا.....؟'' وہ حیرت سے چیخی اور پھر ہنسی تو ہنستی ہی چلی گئی۔

''اف اللہ بیوقوف کہیں کا۔''

''اس میں اتنا ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' اماں کو اس کا ہنسنا برا لگا۔

''اماں آپ نہیں جانتیں وہ کس قدر عجیب ہے۔ شکل سے تو بالکل جوکر لگتا ہے اگر اس میں کوئی خوبی ہے تو صرف یہ کہ محنتی ہے۔ بہت سیدھا ہے اماں۔''

''بیٹا کسی کی سادگی پر اس طرح نہیں ہنستے۔''

''اماں سادگی پر نہیں بیوقوفی پر تو ہنستے ہیں ناں۔ اس نے کیسے سوچ لیا کہ میں اس سے شادی کروں گی؟''

''بے چارے پر بڑا بوجھ ہے باپ نہیں ہے اس لیے چار بہنوں کا فرض اسے ہی ادا کرنا ہے۔ ہم ہی جیسے سادہ اور غریب سے لوگ ہیں۔ مجھ تو اس کی ماں کی سادگی بہت بھائی ہے۔ اس لیے تو تم سے پوچھا تھا۔''

''اماں آپ بھی بس۔ سارے جہان کا درد تو آپ ہی کے سینے میں ہے۔ لیکن رئیس احمد میری منزل نہیں ہے اماں۔ ایک رئیس احمد ہی نہیں ہمارے معاشرے میں آپ کو بہت سے گھرانے ایسے مل جائیں گے جن کا یہی المیہ ہے۔ اب میں ہر کسی سے شادی تو نہیں کر سکتی ناں۔''

''تو تیری پسند کیا ہے؟''

''میری پسند.....؟ اماں ابھی مجھے اتنی فرصت نہیں ملی کہ میں کسی کو پسند کروں اور آپ اس بیوقوف کی وکالت اس لیے کر رہی ہیں کہ آپ نے اسے دیکھا نہیں ہے اور دیکھیں تو مجھے یقین ہے کہ یہی کہیں گی کہ یہ میری بیٹی کے قابل نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں نجانے کیا تھا کہ اماں خاموش ہو گئیں۔

''ٹھیک ہے جیسے تیری مرضی۔'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے اٹھ گئیں۔

اور پھر دفتر میں جس نے بھی سنا وہ ہنسے بغیر

نہ رہ سکا کہ سیدھا سادھا رئیس احمد ایسا بھی کر سکتا ہے۔ مرد حضرات نے تو براہ راست انھیں مذاق کا نشانہ بنایا تھا۔

''مس تنویہ۔'' رئیس احمد نے اس کی ٹیبل کے پاس آ کر پکارا تو اس نے سر اٹھایا۔

''مس تنویہ مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی کہ آپ میری چاہتوں کا یوں سر بازار تماشا لگائیں گی۔'' انھوں نے کہا تو اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ پھر گویا ہوا۔

''میں نے واقعی آپ سے محبت کی تھی۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ جو ہم سوچتے ہیں اگلا بھی وہی سوچے اگر آپ کو میری رفاقت قبول نہ تھی تو اس طرح میرا مذاق تو نہ بنواتیں۔ میں نے شاید واقعی زمین پر کھڑے ہو کر آسمان پر چمکنے والے ستارے کو دامن میں بھرنے کی کوشش کی تھی۔ تنویہ خدا کرے آپ کو بھی کبھی کسی سے اتنی شدید محبت ہو جائے کہ اس کے بنا زندگی عذاب لگنے لگے لیکن میں یہ بددعا کبھی نہیں دوں گا کہ آپ کو اس کا ساتھ نہ ملے میری ہمیشہ یہی دعا ہوگی کہ آپ جہاں رہیں خوش رہیں اور زندگی کی تمام خوشیاں آپ کو ملیں۔'' وہ گہری سانس لینے کے لیے رکے جبکہ وہ ابھی تک دم سادھے بیٹھی تھی۔

''یہ میرا استعفیٰ ہے اسے ارسل صاحب تک پہنچا دیجیے گا' خدا حافظ۔'' اس نے ایک بند لفافہ ٹیبل پر رکھا اور تیزی سے باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے اور بے دھیانی میں اندر آتے ارسل سے ٹکرا گیا۔

''سوری سر۔' اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

''اسے کیا ہوا؟'' اس نے تانیہ سے پوچھا جو اس کے ٹکرانے کی وجہ سے اپنی ہنسی ضبط کر رہی تھی اور جواب میں اس نے تمام صورتحال اس کے گوش گزار کر دی۔

ساری بات سننے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بالکل خاموش اور ساکت بیٹھی دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ رئیس احمد اس حد تک گزر جائے گا۔

''بیچارے کا باپ نہیں ہے چار بہنوں کا بوجھ ہے اس کے کندھوں پر۔'' اماں کی آواز دور سے آتی سنائی دی اور اب وہ صرف اس کی وجہ سے اچھی بھلی جاب چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اس کے بعد اس کا کوئی کام کرنے کو جی نہ چاہا۔ بیگ اٹھایا اور خاموشی سے آفس سے باہر آ گئی۔ اور پھر کئی دنوں تک ملول اور خاموش سی رہی۔

''یار لگتا ہے رئیس احمد کے جانے کے بعد تمہیں اس کی محبت کا احساس ہوا ہے۔ اور اب خود بھی اس کی محبت میں گرفتار ہو گی ہو۔'' تانیہ نے اس کی خاموشی کو نوٹ کرتے ہوئے کہا تو وہ خاموش نظروں سے اسے تکنے لگی۔

'' تمہاری اس خاموشی کو اپنی بات کی تصدیق سمجھوں؟''

''پتا نہیں تانیہ ایک عجیب سے احساس جرم میں گھری ہوں میں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس حد تک گزر جائے گا کہ صرف میری وجہ سے جاب چھوڑ دے گا۔ اب اس کی بہنوں کا کیا بنے گا۔ تانیہ اس کی ماں تو یقیناً مجھے بددعا دے رہی ہوگی۔ میں نے واقعی اس کی بہت انسلٹ کی ہے۔ ہر انسان کی عزت نفس ہوتی ہے مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ میں اسے اس طرح بے عزت کروں۔''

''بے عزت تم نے کیا یا خود اس نے اپنی بے عزتی کا سامان کیا۔ ہر انسان کو اپنا دامن دیکھ کر ہاتھ پھیلانے چاہئیں۔ کہاں تم اور کہاں وہ؟''

''نہیں تانیہ میں کوئی بہت مافوق الفطرت

چیز نہیں ہوں، بس مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ مجھے اس طرح اس کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے تھا۔ میں نے اسے ہرٹ کیا تو دوسروں کو بھی موقع مل گیا اس پر ہوٹنگ کرنے کا۔''

''تو کیا اب تم اس الو سے شادی کرلوگی؟''

تانیہ کو واقعی اس پر غصہ آ رہا تھا۔

''نہیں ایسا تو میں نہیں کرسکتی لیکن کچھ نہ کچھ کروں گی ضرور۔''

اور پھر اس نے منصور صاحب سے بات کی کہ وہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں اور انھوں نے حامی بھر لی تھی۔

''کیا بہت غم ہے رئیس احمد کے چلے جانے کا؟'' ارسل کر جب اس بات کا پتا چلا تو اس نے اس سے بڑے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''تو پھر یہاں کیوں سوگوار شکل بنا کر بیٹھی رہتی ہو جاؤ پھر رچا لو شادی اس کے ساتھ۔'' وہ ایکدم چڑ گیا۔

''ارسل صاحب میرا اور آپ کا تعلق صرف دفتری معاملات تک ہے اپنے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کی میں کسی کو بھی اجازت نہیں دے سکتی۔'' اس نے کہا اور وہاں سے اٹھ آئی۔

منصور صاحب نے بتایا تھا کہ اس کے علم میں لائے بغیر انھوں نے اپنے کسی جاننے والے کی فرم میں اسے جاب دلوا دی تھی۔ اور یہ خبر سنتے ہی وہ کافی حد تک مطمئن ہوگئی۔

.....

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔ ان سب کی دن رات کی محنتوں کے نتیجے میں کمپنی دن بہ دن ترقی کی راہوں پر گامزن تھی۔ منصور صاحب جو کہ پہلے اس کمپنی کے ورکرز کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اس کو خود ڈیل کرتے تھے اب وہ خود ان سب سے مشورہ کے طلبگار رہتے کہ وہ واقعی ان کی ذہانت کے معترف تھے۔ اور آج کل تو وہ ویسے بھی بیرون ملک کاروبار کو وسعت دینے کی پلاننگ کر رہے تھے۔ جس کے لیے انھیں ایک ہیلپر کی ضرورت تھی۔ انھوں نے ارسل سے تنویر کا مطالبہ کر دیا۔ وہ تنویر کو بیرون ملک اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن ارسل نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ''ابھی ہماری کمپنی اس بات کی متحمل نہیں ہوسکتی کہ سٹاف کا کوئی بھی فرد غیر حاضر رہے۔ اپنے کام کو جتنا تنویر سمجھتا ہے کسی اور کو سمجھنے میں وقت لگے گا۔ میرے سٹاف کا ہر فرد اپنے خانے میں بالکل فٹ ہے۔''

''بڑے خود غرض ہو یار چلو ایسا کرو تنوینہ کو میرے ساتھ بھیج دو۔''

''تنوینہ.....؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے پاپا میرا سارا کا کام کون دیکھے گا۔''

''تانیہ ہے نا اور ویسے بھی تم اس کے کام سے مطمئن تو ہو نہیں۔ اسی بہانے کچھ عرصہ تک تمہاری بھی جان چھوٹ جائے گی اور وہ بھی ریلیکس کرے گی۔'' بابا نے کہا تو وہ لب بھینچ کر خاموش ہوگیا۔

''بہرحال یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے اس سلسلے میں میں خود تنوینہ سے بات کروں گا۔ اور اگر وہ چاہے تو پھر میں مستقل طور پر اسے اپنے ساتھ ہی رکھ لوں گا۔'' اور یہ تو وہ بھی جانتا تھا کہ پاپا کی بات وہ کبھی نہیں ٹالے گی۔

لیکن پھر تمام پلاننگز دھری کی دھری رہ گئیں اور وہ حادثہ رونما ہوگیا جس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ اچانک کیا ہوگیا۔

ارسل نے انھیں رات سٹڈی روم میں کام میں مصروف دیکھا تھا لیکن صبح جب بیگم منصور وہاں گئیں تو وہ کرسی پر بیٹھے ٹیبل پر بازو اور سر رکھے سو رہے تھے۔

''منصور صاحب۔'' انھوں نے آواز دے کر جگانا چاہا لیکن ان کے وجود میں کوئی حرکت نہ ہوئی تو شانے پکڑ کر ہلایا۔

''منصور صاحب۔'' لیکن وہ جواب دینے کی بجائے ایک طرف کو لڑھک گئے۔ ان کا جسم بے جان پڑا تھا۔ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ رات تین بجے کے قریب انھیں شدید ہارٹ اٹیک ہوا جو ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔

جس نے بھی سنا حیران رہ گیا۔ لوگوں کا ایک سیل رواں تھا جو بہا چلا آتا تھا۔ ارسل صبر و تحمل کا پہاڑ بنا ایک طرف سر جھکائے بیٹھا تھا۔ بیگم منصور ساکت وجود لیے اپنے شوہر کے کفن میں لپٹے بے جان وجود کو ایک ٹک تکے جا رہی تھیں۔ نہ کوئی بین نہ چیخ و پکار بس لوگ ہی تھے جو مختلف چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔

تمام سٹاف کے ساتھ وہ بھی وہاں آئی تھی لیکن وہاں موجود ایک ہستی کو دیکھ کر بنا کسی کو کچھ بتائے خاموشی سے نکل آئی۔

''بس بیٹا آپ میرے لیے دعا کیا کرو کہ خدا مجھے پچھتاووں کے بھنور سے نکال دے۔''

''کہوں گا۔ وقت آنے پر اپنے تمام جرموں کا اقرار کروں گا۔ لیکن ابھی تو مجھے ان زیادتیوں کا کفارہ ادا کرنا ہے۔''

ان کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''انکل آپ تو تمام بوجھ اپنے سینے پر ہی لے گئے۔ آخر کچھ تو کہا ہوتا۔ وہ کون سے جرم تھے وہ کون سی زیادتیاں تھیں جن کا کفارہ آپ نے ادا کرنا تھا۔ جو مجھ پر ڈھیروں احسانات کر کے یہ بوجھ اتارنا چاہتے تھے۔ کہیں اس کے پیچھے وہ ہستی ہی تو کارگر نہیں تھی۔''

اس کے آگے وہ کچھ بھی نہ سوچ سکی سڑک کے کنارے دھیرے دھیرے چلتے آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر تھا۔ وہ اتنی بے خبر تھی کہ آنسو صاف کرنا بھی بھول گئی تھی۔ چلتے چلتے جب وہ بالکل نڈھال ہو گئی تو ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر دور خلاؤں میں گھورنے لگی۔

''ایکسکیوزمی۔'' ایک مانوس سی آواز کانوں سے ٹکرائی تو اس نے خالی خالی نظروں سے سامنے کھڑے رئیس احمد کی طرف دیکھا۔

''مس تنویہ کسی ہیں آپ؟ میں بڑی دیر سے آپ کو یونہی بے مقصد چلتے ہوئے دیکھ رہا ہوں آپ کے کھوئے ہوئے انداز سے مجھے خطرہ تھا کہ کہیں کوئی حادثہ ہی نہ ہو جائے۔''

''کیسے ہیں آپ؟'' اس کے لہجے میں واضح نمی تھی۔

''آپ کی دعاؤں اور کوششوں سے بالکل ٹھیک' آپ میری شادی میں تشریف نہیں لائیں جبکہ میں نے بہت انتظار کیا تھا۔''

''بس یونہی۔'' وہ چاہنے کے باوجود رسماً بھی نہ مسکرا سکی۔

''کیسی ہے آپ کی مسز؟''

''بہت اچھی بہت مخلص اور اب تو ماشاءاللہ میرے دو بیٹے ہیں۔''

''مبارک ہو آپ کو۔'' اس نے اس کا چہرہ کھوجتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''بہت بہت شکریہ تنویہ جی میں واقعی اپنی اس زندگی سے بہت خوش اور مطمئن ہوں کیونکہ میں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ جو چیزیں دسترس سے باہر ہوں اس کی تمنا نہیں کرنی چاہیے۔ میں شاید واقعی بیوقوف تھا۔'' اس کی بات پر وہ خاموش رہی۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ شاید اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بات کرے یا پھر جو وہ کہنا چاہتا تھا کہہ نہیں پا رہا تھا۔ کیونکہ کئی بار اس نے لب کھولے اور

بھینچے تھے۔

''رئیس صاحب آپ پوچھیں گے نہیں کہ میں کہاں سے آ رہی ہوں اور تجھے کیا ہوا ہے؟''

''پوچھنا چاہتا ہوں تنو ینہ جی لیکن اس ڈر سے کہ کہیں آپ اسے بے تکلفی کے زمرے میں نہ لے آئیں۔ اس لیے ہمت نہیں ہو رہی۔''

''رئیس صاحب۔'' اس کی آواز رندھ گئی۔

''رئیس صاحب منصور صاحب ..... منصور صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔''

''نہیں رہے ..... وہ چلے گئے۔'' اور پھر اس کا ضبط جواب دے گیا اور وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور لرزتے وجود کے ساتھ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

.....

زندگی یکدم ہی بے مقصد ہو گئی تھی۔ تمام پلاننگز سارے اسائنمنٹ دھرے رہ گئے تھے۔ وہی دفتر جہاں ہر وقت کام ہوتا تھا اب وہاں سب لوگ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ خاموش تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اگر کسی نے کچھ کہا تو کہیں پھر کوئی حادثہ رونما نہ ہو جائے۔ ایسے میں تانیہ نے اسے سمجھانا اپنا فرض سمجھا

''وینہ پھر گئیں تھیں تم؟'' اس نے پوچھا تو وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر چند لمحوں بعد مختصراً سا جواب دیا۔

''نہیں۔''

''تمہیں ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا اس دن بھی تم فوراً ہی کسی کو بتائے بغیر کسی سے ملے بنا ہی نکل آئی تھیں۔ جانتی ہو ارسل صاحب کی نگاہیں ہر آن تمہیں ڈھونڈ رہی تھیں اور ان آنکھوں میں واضح تحریر تھی کہ ''وہ کیوں نہیں آئی۔''

''پلیز تانیہ۔'' وہ اپنی کرسی پر سیدھی ہو بیٹھی۔

''مجھے ایسے خواب مت دکھاؤ کہ جن کی کوئی تعبیر نہ ہو۔'' کہیں ایسا نہ ہو کہ رئیس احمد کی دی گئی دعا بھی میرے لیے بددعا بن جائے۔'' اس کے جواب پر تانیہ خاموش رہ گی کہ بہر حال حقیقت حال سے وہ بھی واقف نہ تھی۔

گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ تمام منصوبے بکھرتے جا رہے تھے۔ دفتر تو سب آتے سوائے ارسل کے لیکن کام کروانے والا کوئی نہ تھا تو ورکرز بھی لاتعلق ہو گئے تھے۔ ارسل کے بعد تمام تر ذمہ داری تنو ینہ پر عائد ہوتی تھی لیکن اس کا تو جیسے ہر کام سے جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی کرسی پر آنکھیں موندے بیٹھی رہتی۔

تانیہ اور تنویر نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ اپ سیٹ ماحول کو کنٹرول میں کر کے ورکرز سے کام لیا جائے اور اس کوشش میں سرمد اور فہد بھی ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ ناعمہ اور راحیلہ بھی ان کی مدد میں پیش پیش تھیں۔ لیکن وہ اس کوشش میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے تھے۔

تانیہ کا صبر جواب دے گیا تو وہ چلا اٹھی۔

''تنو ینہ آخر کب تک چلے گا یہ سب کچھ؟ ارسل صاحب بھی نہیں آ رہے تم بھی کسی کام میں دلچسپی نہیں لے رہی۔ تمام سٹ اپ سیٹ ہو گیا ہے ہماری دو برسوں کی محنت اکارت ہو رہی ہے۔ جس کمپنی کو ہم نے اپنی نیندیں حرام کر کے یہاں تک لائے دن رات کی محنتوں سے اونچا مقام دیا ہے اب وہ پستی کی طرف جا رہی ہے۔''

''میں کیا کروں تانیہ میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا۔''

''کیوں آخر کب تک؟''

''پتا نہیں۔'' وہ کہہ کر دوبارہ پہلے والی پوزیشن میں چلی گئی اور وہ بے بسی سے اس دیکھتی رہ گئی۔

''پتا ہے تانی۔'' وہ آنکھیں موندے

موندے مخاطب ہوئی۔

''مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں ایک دفعہ پھر یتیم ہوگی ہوں۔'' دنیا جہاں کا کرب اس کے لہجے میں تھا۔

''شاید میری قسمت میں باپ کا پیار ہے ہی نہیں۔'' آنکھوں سے بہتے آنسو دائیں بائیں لڑھک گئے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے درد سے سینہ پھٹ جائے گا بے آواز سسکی ہونٹوں تک آ کر دم توڑ گئی۔

''وینہ پلیز سمجھنا لوخود کو۔'' تانیہ نے گھبرا کر کہا کیونکہ اس کی اندرونی اذیت کے آثار چہرے پر نمایاں تھے۔ تانیہ نے اسے گلے لگا لیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس نے اسے رونے دیا تا کہ دل کا بوجھ ہلکا ہو۔

.....

ارسل صاحب ہماری کمپنی کو دن بہ دن بہت زیادہ نقصان ہو رہا ہے۔'' تنویر اس وقت اس کے گھر کے ڈرائنگ روم میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔

''ہونے دو۔'' وہ بھی صوفے کی پشت پر سر رکھے آنکھیں موندے ہوئے تھا۔

''سر پلیز ایسے تو نہ کہیں۔ ہم نے اس کمپنی کے لیے دن رات ایک کیے ہیں۔۔ وہ تڑپ ہی تو اٹھا۔

''تنویر صاحب یہاں جیتا جاگتا انسان منٹوں میں ختم ہو جاتا ہے تو باقی چیزوں کی کیا حیثیت؟'' وہ انتہائی دلبرداشتہ انداز میں بولا۔

''وہ تو ٹھیک ہے سر لیکن یہی قانون قدرت ہے۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے لیکن ہم جانے والوں کے ساتھ نہیں جا سکتے۔ ہم زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہیں۔ اپنا وقت آنے پر ہمیں بھی جانا ہے تو پھر.....''

''تو پھر تنویر صاحب یہ کہ جب ہمیں معلوم ہے کہ ہمیں بھی جانا ہے تو پھر اتنا جنجال پالنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں کرتے ہیں ہم یہ سب کچھ آخر کس لیے کس کی خاطر؟''

وہ جیسے اپنا اختیار کھو بیٹھا تو تنویر چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ شاید وہ اس کے سنبھلنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔

''سر میں آپ کی اندرونی کیفیت اور دلی جذبات سے واقف ہوں۔ ادھر مس تنوینہ ہیں تو وہ بھی کچھ نہیں کر پا رہیں۔''

''اسے ضرورت بھی کیا ہے کچھ کرنے کی انھیں تو فراغت کا موقع ہی اب ملا ہے۔ جو چاہے مرضی کریں اب انھیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے تو اسے کیا ضرورت ہے کام کرنے کی۔ بیٹھے بٹھائے تنخواہ مل جائے گی اور کیا چاہیے۔ تنویر کیا اس دنیا میں مقصد صرف پیسے کا حصول ہی رہ گیا ہے۔ آپ کے سامنے کیا نہیں کیا پاپا نے اس لڑکی کے لیے لیکن اس کے نزدیک انسانی زندگی کی کوئی قدر و اہمیت۔''

کئی دنوں کا اندر ہی اندر پکتا لاوا آخر کار نہ چاہتے ہوئے بھی بہہ نکلا۔ وہ بولنے پر آیا تو بولتا ہی چلا گیا کہ مخاطب کو بھی کچھ کہنے کا موقع نہ دیا۔ لیکن جیسے ہی وہ خاموش ہوا تنویر بولے بنا نہ رہ سکا۔

''نو سر یہ بات نہیں آپ کی طرح وہ بھی بہت اپ سیٹ ہیں۔ انھوں نے بہت اثر لیا ہے منصور صاحب کی وفات کا وہ تو یہاں تک کہتی ہیں کہ میں ایک دفعہ پھر یتیم ہو گئی ہوں۔''

''بس مسٹر تنویر مجھے بنا باتوں سے مت بہلائیں۔'' اس نے ہاتھ کھڑا کر کے اسے آگے بولنے سے روک دیا۔

''میں ان غریب اور مفلس لوگوں کی اصلیت سے اچھی طرح واقف ہو گیا ہوں آپ کو میرے سامنے کسی کی صفائیاں پیش کرنے کی

ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کہا تو وہ لب بھینچ کر خاموش ہوگیا۔

کچھ ہی دیر بعد بیگم منصور آ گئیں ان کے پیچھے ایک ملازم چائے کی ٹرالی کھینچتا ہوا لا رہا تھا۔

''السلام علیکم میڈم۔'' وہ ان کے احترام میں کھڑا ہوگیا۔

''وعلیکم السلام جیتے رہو بیٹا۔ کیسے ہیں آپ؟''

''جی الحمدللہ بالکل ٹھیک ہوں۔''

''گھر میں سب خیریت ہے؟' وہ افسردہ سی سنجیدگی سے پوچھ رہی تھیں۔

''جی شکر ہے اللہ کا۔''

پھر ملازم نے چائے سرو کی اور چلا گیا تو وہ گویا ہوئیں۔

''بیٹا آپ ہی اسے سمجھائیں جس کا وقت آ جائے اسے آخرکار جانا ہی ہوتا ہے۔ جانے والوں کا نعم البدل تو کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن ہمیں زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کرنا ہی پڑے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ گھر سے باہر نکلے گا دوبارہ زندگی میں دلچسپی لے تو یقیناً دل بہل جائے گا۔''

''جی آنٹی بالکل ٹھیک کہا آپ نے میں بھی تو ان سے یہی عرض کر رہا ہوں۔'' اس نے جھکی نظروں کے ساتھ بے حد احترام سے کہا۔

''اپنا اور اپنے پاپا کا تمام بزنس اب اسے ہی سنبھالنا ہے۔ ان کے تمام منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانا اب اسی کا فرض ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو یقیناً بزنس کا بہت نقصان ہوگا۔'' وہ بہت دھیمے دھیمے اور سمجھانے والے لہجے میں بول رہی تھیں۔ اور ایک وہ تھا کہ سب باتوں سے بے نیاز بیٹھا تھا۔

''ارسل صاحب آنٹی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''

''چھوڑو یار یہاں تو ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہے۔'' اس نے انتہائی اکتائے ہوئے اور بدگمانیوں سے بھرپور لہجے میں کہا تو بیگم منصور کے مقدس چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

''او کے سر اجازت دیں۔'' تھوڑی دیر بعد تنویر نے کہا تو وہ بھی اس کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ بیگم منصور کو خدا حافظ کہہ کر وہ دونوں باہر آ گئے۔

''سر چھوٹا منہ بڑی بات ہو جائے گی لیکن کہوں گا ضرور کہ ان بدگمانیوں کو دل سے نکال کر دیکھیں دنیا بہت خوبصورت ہے اور خاص طور پر آپ کے اردگرد بسنے والے لوگ بہت اچھے اور مخلص ہیں۔'' اس نے کہا اور تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا گیٹ عبور کر گیا۔

.....

''مس تنویہ ہم سب جانتے ہیں کہ منصور صاحب آپ کو بہت چاہتے تھے آپ کو بیٹی بنایا تھا انھوں نے' وہ واقعی بہت شفیق انسان تھے۔ ان کے احسانات کا بوجھ نا صرف آپ پر بلکہ ہم سب کے کندھوں پر بہت زیادہ ہے۔ لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ہم بھی ثابت کر دکھائیں کہ ہم کتنے مخلص ہیں۔ ارسل صاحب اس اچانک حادثے سے ذہنی طور پر اتنے اپ سیٹ ہیں کہ ابھی انھیں مزید ڈسٹرب کرنا ٹھیک نہیں۔ تو ایسے میں ہمارا فرض ہے کہ اس کمپنی کو مزید نقصان سے بچائیں۔'' وہ سب اس وقت اس کے کمرے میں بیٹھے تھے اور تنویر کے ساتھ ساتھ سرمد اور فہد بھی اسے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''میڈم آپ کو پتہ ہے اس ماہ کا سب سے اہم مسئلہ کیا ہے؟'' سرمد نے کہا تو وہ اس کی طرف سے دیکھنے لگی۔

''ورکرز کی تنخواہیں۔'' اس نے چونکانے والے انداز میں کہا۔

''پچھلے ماہ کی تنخواہیں بھی اکاؤنٹس میں سے ادا کی گئی تھیں کیونکہ منصور صاحب کی وفات

کے پیش نظر دفتر بند ہونے کی وجہ سے کام نہیں ہو سکا۔ لیکن اگر ورکرز کو پے منٹ نہ کی جاتی تو یقیناً بہت مشکل ہوتی۔ کام تو اس ماہ میں بھی بالکل نہیں ہوا لیکن ورکرز تو آتے ہی رہے ہیں اور اگر پچھلے ماہ کی طرح اس دفعہ بھی پے منٹ کم دی گئی یا نہ دی گئی تو سب بدگمان ہو جائیں گے۔'' سرمد نے ساری تفصیل اس کے گوش گزار کی تو اس کے چہرے پر تفکر کی لکریں ابھر آئیں اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ لیکن کچھ سمجھ نہ آیا کیونکہ مہینہ ختم ہونے میں صرف دس دن رہ گئے تھے۔ لیکن اب وہ پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔

''تو پھر اس کا کیا حل ہو سکتا ہے؟'' اس نے انتہائی پریشانی سے پوچھا۔

''اس کا حل یہ ہی ہے کہ ہم اپنی اپنی جیب ہلکی کریں اور جو کچھ دن ہیں ان میں دن رات محنت کریں۔'' تنویر نے مسکرا کر کہا۔

اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ دوبارہ سے اسائنمنٹ تیار کیے گئے مختلف کمپنیوں کے ساتھ میٹنگز کی گئی۔ دن کے ساتھ ان کی راتیں بھی آفس میں ہی گزرنے لگیں۔ اور پھر ان کی محنتوں نے رنگ دکھایا اور وہ آہستہ آہستہ تمام حالات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے۔ ورکرز کی پے منٹس کچھ دیر سے ہی سہی لیکن انھوں نے مل بانٹ کر ادا کر دیں۔ تو سرمد نے سکون کا سانس لیا کہ اکاؤنٹس کا شعبہ اس کے پاس تھا حالات کنٹرول میں آئے تو سب نے شکر ادا کیا۔ حسب سابق کام ہونے لگا۔ جن میٹنگز میں پہلے ارسل اور منصور صاحب جایا کرتے تھے اب تانیہ' تنویر اور تنویہ انھیں ڈیل کرتے۔

ابھی وہ لوگ اپنی کامیابیوں پر پوری طرح مطمئن بھی نہیں ہوئے تھے کہ منصور صاحب کی فیکٹری کا مینجر ایک نیا مژدہ لے کر آن پہنچا۔

''پچھلے دو ماہ سے ورکرز کی پے منٹس نہیں ہو سکیں۔ تو وہ باغی ہو چکے تھے ہڑتال تو انھوں نے پچھلے مہینے ہی کر دی تھی لیکن اب فیکٹری کو آگ لگانے کی دھمکیاں دے رہے ہیں وہ کہتے ہیں کہ منصور صاحب کی وفات کے ذمہ دار ہم نہیں ہیں پھر ہمارے بچے کیوں بھوکے مریں۔ وہ لوگ تو یہاں تک دھمکیاں دے رہے ہیں کہ وہ منصور صاحب کی رہائش گاہ پر حملہ کر دیں گے اور بہت ممکن ہے وہ ایسا کر بھی دیں۔ ادھر ارسل صاحب سے رابطہ نہیں ہو رہا۔ فون کرو تو جواب ملتا ہے گھر پر نہیں ہیں۔ گھر جاؤ تو چوکیدار گیٹ سے اندر داخل نہیں ہونے دیتا کہ اسے آرڈر نہیں ہے۔ اس لیے میں آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں کیونکہ منصور صاحب بہت تعریف کیا کرتے تھے آپ سب کی۔ میں بڑی امید لے کر آیا ہوں کہ کمپنی کی طرح آپ فیکٹری کے حالات بھی کنٹرول کر لیں گے۔ مجھ سے جہاں تک ممکن ہو سکا میں نے فیکٹری کی حفاظت کی لیکن اب سب کچھ میرے اختیار سے باہر ہے۔ میں بالکل بے بس ہو گیا ہوں۔''

یہ حالات ان سب کو ایک دفعہ پھر پریشان کرنے کے لیے کافی تھے۔ تنوینہ نے تنویر' سرمد اور فہد کو فوراً ہی مینجر کے ساتھ فیکٹری دوڑایا کہ وہ حالات کا معائنہ کر کے کوئی پائیدار لائحہ عمل تیار کریں۔ لیکن واپسی پر انھوں نے جو حالات بیان کیے وہ ان کی نیند اڑانے کے لیے کافی تھے۔

''اب ارسل صاحب سے رابطہ کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔'' فہد نے کہا تو سب کی نظریں تنوینہ کی طرف اٹھ گئیں جو کہ کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔

اس نے فیکٹری کی تمام ذمہ داری تنویر کے سپرد کی اور اس کی مدد کے لیے فہد اور فریحہ کو ساتھ کر دیا۔ جبکہ تنویر بضد تھا کہ وہ خود اس کے ساتھ چلے کیونکہ وہ اس کی بروقت منصوبہ بندی کا اس

قدر قائل تھا کہ وہ ہر معاملے میں اسے ساتھ گھسیٹتا اس کے اس طرح کرنے پر کبھی کبھی تانیہ شرارت سے کہتی کہ 'دال میں کچھ کالا ہے۔'

''یار کیسی باتیں کرتی ہو کسی کی ذہانت کو سراہنا اور محنت و دیانتداری کی داد دینا کوئی بری بات ہے کیا؟ میرے دل میں تنویرہ کے لیے بے حد عزت اور بے حد احترام ہے کہ وہ واقعی احترام کے قابل ہے۔''

''بہر حال تنویر تم جو بھی کہو وینہ کو میں بہت اچھی طرح جان گئی ہوں وہ بہت مضبوط کردار کی لڑکی ہے۔ بہت انا والی کسی سے نہ دبنے والی' اگر وہ کسی سے دبتی ہے تو صرف ارسل سے۔ اور وہ بھی اس کی مجبوری ہے کہ ماتحتی آڑے آتی ہے ورنہ شاید اس کو بھی کھری کھری سنانے سے باز نہ آئے۔ اور تم بھی کسی خوش فہمی میں مت رہنا وہ تمہیں ہرگز گھاس نہیں ڈالے گی۔

''ہاں یار تم میرا پیچھا چھوڑو تو کوئی دوسری لڑکی مجھے گھاس ڈالے ناں۔'' اس نے شرارت سے بھرپور لہجے میں کہا۔

''تنویر..... تنویر تم باز آ جاؤ اپنی حرکتوں سے۔'' تانیہ اچانک بلی کی طرح جھپٹی تو اس نے ہنستے ہوئے اس کی نازک کلائیاں مضبوطی سے پکڑ لیں۔

''تانی میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھو کیا تمہیں اپنے علاوہ کسی اور کی شبیہہ نظر آتی ہے ان میں؟''

اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا لیکن اس کی آنکھوں میں نجانے کیسے جذبے ہلکورے لے رہے تھے کہ تانیہ جیسی انتہائی بولڈ لڑکی بھی نظریں چرا گئی۔ تنویر اس کی اس حرکت پر قہقہہ لگا کر رہ گیا۔

.....

چند دن بھاگ دوڑ کر کے بینک سے قرض لے کر فیکٹری کے ورکرز کی تنخواہیں ادا کی گئیں۔ کام دوبارہ شروع کیا گیا۔ فہد کی پرجوش تقریروں نے مزدوروں میں محنت اور دیانت داری کا ایک نیا جذبہ پھونک دیا۔

دن بہ دن فیکٹری کے حالات کچھ بہتر ہونے لگے تھے۔ دن رات کی محنت کی تھکن اور کچھ موسم کی تبدیلی نے اس کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ آج وہ فلو اور بخار کے باوجود آفس چلی آئی تھی۔ لیکن سر میں شدید درد اور چھینکوں کی وجہ سے اس سے کوئی کام نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ اب تک چار ڈسپرین اور چار کپ چائے پی چکی تھی۔ تنویر تانیہ اور سرمد فیکٹری گئے تھے۔ اس کی طبیعت زیادہ خراب دیکھ کر فہد اس کے پاس چلا آیا۔

''میڈم آپ کی طبیعت بہت خراب ہے میرا خیال ہے آپ گھر چل کر آرام کریں۔''

''ہاں میرا بھی یہی خیال ہے کہ میں نے آ کر غلطی کی ہے' کوئی کام نہیں ہو پا رہا مجھ سے۔ آج ڈرائیور بھی چھٹی پر ہے اور ویگنوں میں دھکے کھانے کی مجھ میں ہمت نہیں۔'' اس نے اپنی سرخ ہوتی ناک بار بار رگڑتے ہوئے کہا۔

''اگر مائینڈ نہ کریں تو میں آپ کو ڈراپ کر دوں؟'' اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا تو وہ اس کی بات سن کر فوراً اٹھ گئی۔

''ہاں چلو ٹھیک ہے۔'' اور پھر وہ فریحہ اور راحیلہ کو ہدایات دیتی ہوئی فہد کے ساتھ اس کی گاڑی میں آ بیٹھی۔ راستے میں ڈاکٹر سے چیک کروا کر دوائی لی اور گھر چلی آئی۔

''فہد آؤ نا اندر۔''

''نو میڈم' تھینک یو۔''

''نو تھینکو پہلی مرتبہ میرے گھر آئے ہو چائے کے بغیر نہیں جانے دوں گی۔ چلو آؤ۔'' اس نے کہا اور گاڑی سے نکل آئی وہ گاڑی لاک کرتا اس کے پیچھے چلا آیا۔

''ہارن کی آواز سن کر نائمہ بھاگتی ہوئی گیٹ تک آئی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا سانس پھولا ہوا اور رنگت سرخ ہوگئی تھی۔

''ارے آپا آپ اتنی جلدی طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟''

''آرام سے نیمی آرام سے' کیا ہوگیا؟''

''آؤ فہد اس سے ملو یہ ہے میری پیاری سی بہن نائمہ اور نیمی یہ میرے کولیگ ہیں فہد۔'' اس نے تعارف کرایا تو نائمہ ایک اجنبی کو سامنے دیکھ کر نروس ہوگئی۔

اس سے پہلے اس گھر میں کبھی کوئی غیر مرد نہیں آیا تھا۔ زین کے دوست اکثر آتے تھے۔ لیکن باوجود بڑی بہن کے زین نے اسے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ ان کے سامنے ہرگز نہیں آئے گی۔ اور نہ ہی اماں کو یہ بات پسند تھی لیکن آج آپا ایک اجنبی کو گھر لے آئی تھیں۔

''اماں کہاں ہیں؟'' اس نے چلتے چلتے پوچھا۔

''وہ سامنے والے گھر میں جن کی بیٹی کی منگنی ہوئی ہے مبارکباد دینے گئیں ہیں۔ آنے والی ہیں۔''

''ٹھیک ہے تم فہد کو ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ اور چائے پلاؤ اور فہد تم اماں سے مل کر جانا' میں اب آرام کروں گی۔'' آپا کی بات پر اسے حیرت تو ہوئی لیکن خاموش رہی۔

''کیا کرتی ہیں آپ؟'' وہ چائے لے کر آئی تو اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں بس گھر میں رہتی ہوں۔'' اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

''کیوں پڑھتی نہیں ہیں؟''

''بی۔اے کے بعد فارغ ہوں۔''

فہد نہ جانے کیوں اس کا انٹرویو لینے لگا۔

''آگے ایڈمشن نہیں لیا؟''

''جی نہیں اتنا ہی کافی ہے مجھے پڑھائی سے زیادہ گھر داری کا شوق ہے۔''

''او آئی سی پھر تو آپ کافی سگھڑ ہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا تو وہ خاموش ہی رہی کہ اس کی نگاہیں اسے نروس کر رہی تھیں۔ اسی لمحہ ڈوبیل ہوئی۔

''شاید اماں آگئیں۔'' وہ کہتی تیزی سے نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد اماں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ اس نے اٹھ کر سلام کیا اور انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بیٹھنے کو کہا۔ نائمہ نے شاید ساری تفصیل انھیں بتا دی تھی۔ وہ تھوڑی دیر رسماً سی گفتگو کے بعد اٹھ گیا تھا کہ اسے جلد از جلد دوبارہ آفس پہنچنا تھا۔

اس کی طبیعت سنبھلنے کی بجائے زیادہ خراب ہوگئی تھی سبھی باری باری اس کی عیادت کے لیے آئے تھے۔ فہد تو تقریباً روزانہ ہی آتا تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ بخار کے بعد اس کی طبیعت سنبھلی تھی۔ خود کو قدرے بہتر محسوس کرتے ہوئے وہ اماں کے منع کرنے کے باوجود آفس چلی آئی۔

''سب نے بڑی خوشدلی سے اس کا استقبال کیا۔

''شکر ہے وینہ تم آئی ہو' ورنہ میں اکیلی پاگل ہی ہوگئی تھی کام کر کر کے۔'' تانیہ نے کہا تو وہ مسکرا دی۔ شام کو وہ جلد ہی اٹھ گئی تھی۔

گھر پہنچی تو اماں حسب معمول برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں۔ وہ ان کے قریب ہی رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے چند لمحوں میں ہی گھر میں پھیلی خاموشی کو محسوس کر لیا۔ اماں معمول سے زیادہ ہی چپ تھیں۔

''کیا بات ہے اماں خیریت؟'' اس کے پوچھنے پر اماں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر دوبارہ اپنے کام میں

مصروف ہوگئیں۔
''آج فہد کے گھر والے آئے تھے۔'' اماں نے گہری سنجیدگی سے بتایا تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔
''کیوں؟'' حیرت اس کے لہجے میں نمایاں تھی۔
''نائمہ کے رشتے کے لیے۔'' اماں نے طنز اور غصے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بتایا۔
''کیا..... واقعی؟'' اس کی خوشی دیدنی تھی لیکن اماں نے اس کی طرف شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھا۔
''کیوں اماں اس میں ایسی کون سی بری بات ہے؟ فہد بہت اچھا لڑکا ہے۔ اور یقین کریں میں اپنی بہن کے لیے ایسا ہی لڑکا چاہتی تھی۔'' وہ ان کے پاس آ بیٹھی تو اماں رونے لگیں۔
''اماں..... اماں کیسا ہوا ہے؟'' وہ پریشان ہوا ٹھی۔
''اور تو' تو کیا کرے گی' کیا ساری عمر ایسے ہی رہے گی مجھے کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہنے دے گی کہ نہیں۔ نائمہ پورے سات برس چھوٹی ہے تجھ سے اور اب وہ اتنی ہوگئی ہے کہ اس کے رشتے آنے لگے ہیں۔ دنیا والے تجھے بھول گئے ہیں لیکن میں تو ماں ہوں اور کیا جواب دوں گی اپنی بہن کو۔ کیا سوچے گی وہ کہ اپنی بیٹی بیاہ لی اور تیری کمائیاں کھا رہی ہوں۔ بس تنو ینہ اب مجھ سے اور انتظار نہیں ہوتا۔ میں ان لوگوں کو یہی جواب دوں گی کہ میں نے پہلے بڑی کا کرنا ہے پھر چھوٹی کا۔'' اماں کی بات کا مطلب سمجھ کر وہ ایکدم چیخ اٹھی۔
''اماں خدا کے لیے ایسا مت کیجیے گا' فہد میری بہت عزت کرتا ہے بہت احترام ہوتا ہے اس کی نظروں میں میرے لیے بالکل ایسے جیسے زین کی آنکھوں میں جس طرح زین میری عزت کرتا ہے۔ آپ گھر آئی نعمت کو نہ ٹھکرائیں نائمہ کے لیے اس سے بہتر رشتہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔''
اس کی یہ بات سن کر پردے کی آڑ میں کھڑی نائمہ کے دل پر نرم پھوار برس گئی۔ وہ جو صبح سے ایک بوجھ دل پر محسوس کر رہی تھی قدرے کم ہوگیا۔ اور ادھر اماں اس کی بات سن کر کڑے تیوروں سے اسے دیکھنے لگی تو وہ نظریں چرا گئی۔
''اماں آپ فکر کیوں کرتی ہیں وقت آنے پر میں بھی شادی کرلوں گی۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔
''کب آئے گا وہ وقت؟'' اماں چیخ کر بولیں۔
''معلوم نہیں لیکن آپ فہد کے والدین کو ہاں کردیں۔'
''وہ جلد ہی شادی کا کہہ رہے تھے۔''
''تو کیا حرج ہے؟'
''نہیں تنو ینہ تیرے سے پہلے میں اس کی رخصتی نہیں کروں گی۔'' اماں نے اٹل لہجے میں کہا تو وہ سوچنے لگی۔
''ٹھیک ہے میں فہد سے بات کروں گی کہ وہ کب تک انتظار کرسکتا ہے۔'' وہ یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ گئی تو نائمہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔
''نیمی'' اس کی آواز نے قدم جکڑ لیے۔ قریب پہنچ کر اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کا چہرہ اپنی طرف کر کے پوچھا۔
''نیمی تم خوش ہو اس رشتے پر؟'' اس کے سوال پر اس کے چہرے پر گلابیاں بکھر گئیں۔ اسے اپنی یہ شرمیلی سی بہن بے حد عزیز تھی اسے اس طرح کی شرمائی شرمائی کومل اور نازک جذبات والی لڑکیاں بہت پسند تھیں۔
ایک دور تھا کہ وہ بھی بالکل ایسی ہی تھی لیکن

حالات کی سختی نے اسے بھی سخت کر دیا تھا۔ لیکن اس کا دل تو نرم تھا جہاں آج بھی امنگیں اور خواہش جنم لیتی ہیں۔

''بولو بھئی تم سے پوچھ رہی ہوں میں۔'' وہ اس کے چہرے پر پھیلتے رنگوں میں کھوسی گئی تھی۔

''وہ..... آپا آپ؟' اس نے جھجکتے جھجکتے کہہ دیا۔

''میری گڑیا۔'' اس نے محبت اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

''تم میرے لیے پریشان مت ہو صرف اپنے لیے سوچو۔''

''آپا میں خودغرض تو نہیں ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

''آپا آپ ان سے کہہ دیں وہ انتظار کر سکتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ نہیں۔'' اس نے کہا اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

فہد بہ آسانی ابھی صرف منگنی کرنے پر رضامند ہوگیا تھا۔ تانیہ اور تنویر بھی اپنی شادی کی بھرپور تیاریوں میں مصروف تھے سرمد کے ہاں بھی بیٹا ہوا تھا جس کی خوشی میں اس نے چھوٹی سی پارٹی کی تھی۔ راحیلہ بھی میرڈ تھی اور فریحہ انگیجڈ تھی۔ اور بہت جلد پیا دیس سدھارنے والی تھی۔ سب لوگ اپنی اپنی دنیا کی خوشیوں میں مگن و مسرور تھے۔ ایک بس وہ تھی کہ جس کے من کا صحرا ابھی تک کسی کے پیار کی چند بوندوں کے لیے پیاسا تھا۔ بنا سوچے بنا سمجھے نجانے وہ کن راہوں کی مسافر ہوگئی تھی۔ لاشعوری طور پر کس منزل کی متلاشی تھی وہ خود نہیں جانتی تھی۔

.....

ارسل نے پورے تین ماہ بعد آفس میں قدم رکھا تو ہال کمرے میں موجود تمام ورکرز کو اپنے اپنے کام میں مصروف پایا۔ اسے دیکھتے ہی سب احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ باری باری سب نے اس کی خیریت دریافت کی اور اظہار تعزیت کیا۔ وہ سب کا شکریہ ادا کرتا آگے بڑھ گیا۔ اگلے کمرے میں بھی سب مصروف تھے۔ سب سے پہلے فریحہ کی نظر اس پر پڑی وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی ساتھ بیٹھی راحیلہ نے اسے اس طرح اٹھتے دیکھا تو پہلے اس کی طرف پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو وہ بھی سنبھل کر کھڑی ہوئی۔ باقیوں نے بھی ان کی پیروی کی۔ لیکن وہ وہاں رکا نہیں سر کے اشارے سے ان کے سلام کا جواب دیتا آگے بڑھ گیا۔ گلاس ڈور سے دوسرے کمرے میں ایک نظر ڈالی جہاں سامنے ہی تنویہ اپنے کام میں بری طرح مگن تھی اور تانیہ کی ٹیبل کا تھوڑا سا کونہ نظر آرہا تھا۔ ابھی اسے چیئر پر بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ وہ سب چلے آئے۔

''ہمیں خوشی ہے سر کہ آپ نے دوبارہ اپنا آفس جوائن کرلیا ہے۔'' رسمی دعا سلام اور اظہار تعزیت کے بعد تنویر نے کہا۔ باقی سب نے بھی اپنے اپنے ریمارکس دیئے۔ لیکن ایک وہ تھی کہ جس کی طرف اس کی منتظر نگاہیں نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار اٹھ رہیں تھیں لیکن وہ لب سیئے بیٹھی تھی۔ تانیہ نے سب کی نظر بچا کر اسے ٹہوکا بھی دیا لیکن وہ پھر بھی چپ رہی۔

تھوڑی دیر کی گفتگو اور چائے پینے کے بعد سب باری باری جانے لگے وہ بھی ساتھ ہی اٹھنے لگی تو تانیہ نے اس کے شانے پر دباؤ ڈال کر اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا لیکن وہ نظرانداز کر گئی۔

''کیا چنے چبا رہی تھیں تم جو کچھ بک نہیں سکیں۔'' سیٹ پر آتے ہی تانیہ اس پر برس پڑی۔ لیکن وہ ایک نظر اس پر ڈال کر فائل کو کھولنے لگی۔

''وینہ میں کوئی بکواس نہیں کر رہی ہوں۔

اگر تم اپنے منہ سے کچھ پھوٹ پڑتیں تو کیا تمہاری شان میں کوئی فرق آ جاتا؟'' اسے بے حد غصہ آ رہا تھا۔

''کیا کہتی ہیں؟'' وہ بالکل ناسمجھی کے سے انداز میں بولی تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''اتنی بچی نہیں ہو تم۔ اس سے بہتر تھا تم جاتی ہی نہ اندر۔ کیوں اپنے رستے میں خار بچھا رہی ہو تنوینہ حیدر' تم اگر تھوڑا سا اپنے خول سے باہر آ جاؤ تو تمہاری زندگی کی راہوں میں پھول ہی پھول سکتے ہیں۔ کیوں اپنی دشمن بنی ہو۔''

''پلیز تانیہ فضول باتیں مت کیا کرو۔''

''فضول.....؟'' وہ ایکدم بھڑک اٹھی۔

''یہ فضول ہے؟ دیکھا نہیں تھا وہ بار بار تمہاری طرف دیکھ رہا تھا۔ منتظر تھا وہ کہ تم بھی کچھ کہو۔''

''ٹھیک ہے تانیہ میں تمہاری باتوں کو نہیں جھٹلاتی لیکن جو تم سمجھتی ہو وہ کبھی نہیں ہوگا۔ کیونکہ زندگی کی حقیقتیں بہت تلخ ہیں اور میں کسی بھی امید کا دامن نہیں تھامنا چاہتی۔''

''کیسی حقیقتیں؟''

''جب ان حقائق سے پردہ اٹھا تم خود جان ہی لوگی۔''

''وینہ بات دراصل یہ ہے کہ تم نے مجھے کبھی دوست سمجھا ہی نہیں۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

شاید وہ خود بھی اندر سے ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔ کوئی ہمدرد و غمگسار چاہتی تھی۔ اس لیے جب بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔ اپنی زندگی کے نشیب و فراز کی ایک ایک داستان اسے کہہ سنائی۔ اور وہ ساکت سنتی چلی گئی۔

''تنوینہ حیدر تم..... تم واقعی بہت بہادر بہت مضبوط ہو۔'' وہ خاموش ہوئی تو وہ کہے بنا نہ رہ سکی۔

''اب تم بتاؤ تانی کہ ایسے حالات میں میں کسی آس کسی امید کا جگنو اپنی مٹھی میں دبا سکتی ہوں؟''

''پھر بھی وینہ میں تمہارے لیے دعا ضرور کروں گی۔'' وہ خلوص دل سے بولی۔ انشاء اللہ تمہارے راستے میں محبتوں کے پھول ضرور کھلیں گے ایک دن۔

.....

وہ آفس تو آنے لگا تھا لیکن ابھی تک اس نے کسی کام میں دلچسپی نہیں لی تھی اور اس کی کیفیت دیکھتے ہوئے نہ ہی ان لوگوں نے اسے ڈسٹرب کیا تھا ان کے لیے اس کا آ جانا ہی کافی تھا۔

''لیکن آخر کب تک؟'' ایک دن تنوینہ کا حوصلہ جواب دے گیا تو وہ بول ہی اٹھی۔

''تانیہ اس فائل پر ارسل صاحب کے سائن بہت ضروری ہیں۔''

''تو میں کیا کروں اس کے سامنے تو تم چپ کا روزہ رکھ لیتی ہو۔ جاؤ جا کر دکھاؤ اسے۔ میں تو ہال میں ورکرز کو چیک کرنے جا رہی ہوں۔''

''میں نہیں جا رہی تم لے جاؤ۔ میں ادھر جاتی ہوں۔''

''اونہہ تمہارا کام تم خود ہی کرو۔'' وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی تو وہ بھی مجبوراً اٹھی۔

وہ اپنی ریوالونگ چیئر کی پشت پر سر ٹکائے آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ اور نجانے کن سوچوں میں گم تھا کہ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ کوئی اس کے کمرے میں داخل ہوا ہے۔ وہ خاموشی اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ کس قدر کمزور ہو گیا تھا وہ۔ مرجھایا ہوا چہرہ' عام سا گھریلو لباس' مڑے ہوئے آستین' حالانکہ وہ ہمیشہ ڈریس اپ ہو کر آفس آتا تھا۔ اچھا لباس اس کی خوبصورت شخصیت کو

چار چاند لگا دیتا۔ لیکن اب وہ سب چیزوں سے بے نیاز تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس کا ہر چیز سے دل اچاٹ ہو گیا ہو۔ اس کی اندرونی کیفیت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

وہ شاید تنہائی سے فائدہ اٹھا کر خود کو کھوج رہا تھا۔ اور پھر جب اس نے آہستگی سے آنکھیں کھولیں اور وہ عین اس کی نظروں کی زد میں آ گئی تو وہ دھیرے سے پلکیں جھکا گئی۔ وہ چند لمحے خاموش نگاہوں سے اسے دیکھے گیا۔ اور وہ پلکیں جھکائے ٹیبل کی سطح پر رکھے شیشے پر اپنی نرم انگلی پھیرتی رہی۔

''آپ نے اتنی زحمت کیوں کی مس تنوینہ حیدر یہاں تشریف لانے کی مجھے بلا لیا ہوتا میں خود حاضر ہو جاتا آپ کی خدمت میں۔'' کافی دیر انتظار کے بعد بھی جب وہ کچھ نہ بولی تو وہ خود ہی گویا ہوا۔ لہجہ نارمل لیکن جملہ طنز آمیز تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی جسے وہ جھپک جھپک کر پیچھے دھکیلنے لگی۔

''کیوں آئی ہو یہاں؟'' وہ غرا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

''وہ سر..... یہ فائل؟'' اس نے کہا تو وہ سرخ آنکھوں سے اسے گھورنے لگا۔ اس نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا لیکن تاب نہ لا سکی اور پلکوں کی چلمن گرا دی۔

''سر یہ فائل بہت اہم ہے اسے دیکھ لیں۔'' اس نے فائل ٹیبل پر رکھ کر اس کے آگے سرکا دی۔

''کوئی بھی چیز انسان سے زیادہ اہم نہیں ہوتی مس تنوینہ۔'' وہ پھنکارا۔

''آپ کے نزدیک تو کسی انسان کی زندگی اور موت اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ تو پھر ایک بے جان فائل ہے۔'' اس نے وہی فائل اٹھا کر اس کے سامنے پھینک دی۔

''کس کے لیے کون اور کتنی اہمیت رکھتا ہے اس کے متعلق آپ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ اہمیت خونی رشتوں کی ہے اور آپ کے پاس یہ اہمیت موجود تھی جبکہ میرے پاس اس اہمیت کا کوئی جواز موجود نہیں۔ رہی بات خلوص کی تو محض دکھاوے سے کسی کا خلوص واضح نہیں ہو سکتا۔''

''یو..... شٹ اپ۔' وہ اس کے اس طرح اعتماد سے لیکن دھیرے دھیرے بولنے پر بھڑک اٹھا۔

''گیٹ آؤ..... گیٹ آؤ فرام ہیئر۔'' وہ دھاڑا لیکن وہ کھڑی رہی۔

''تنوینہ پلیز چلی جاؤ یہاں سے کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے ہاتھوں سے قتل ہو جاؤ۔'' وہ بے بسی سے چیخا۔

''تو وہ تیزی سے پیچھے ہٹی اور تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔ اپنی سیٹ تک پہنچتے پہنچتے وہ بالکل نڈھال ہو چکی تھی اس لیے چیئر پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

''کاش کہ ارسل منصور تم جان سکتے کہ میں نے اس دوہرے غم کو کس طرح سہا ہے کس طرح اس دکھ کا مقابلہ کیا ہے۔'' اس نے بڑے کرب سے سوچا اور بہت سے آنسو دائیں بائیں بہہ گئے۔

''وینہ۔'' تانی کی آواز پر اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ اس کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

''وینہ آخر تم اسے بتا کیوں نہیں دیتیں؟''

''ہوں۔'' طنزیہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ کر دم توڑ گئی۔

''تاکہ وہ مزید مجھ سے بدظن ہو جائے نہیں تانیہ مجھ میں مزید ذلت سہنے کی ہمت نہیں ہے۔''

''ہوسکتا ہے جو تم سوچ رہی ہو ویسا نہ ہو۔''
''نہیں تائی مجھے بھیک اور خیرات نہیں چاہیے۔''
''کب تک ماضی اور مستقبل کے درمیان لٹکتی رہو گی؟''
''جب تک میرے خدا کو منظور ہوا۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا اور سامنے پڑی فائل کھولی جس کا صاف مطلب تھا کہ اب وہ مزید اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

.....

زندگی ایک دم ہی بے کیف ہوگئی تھی وہ ایک چلتی پھرتی کام کرنے والی مشین بن کر رہ گئی تھی۔ جس کا مقصد کام کام اور صرف کام رہ گیا تھا لیکن اب وہ تھکنے لگی تھی۔ کسی سایہ دار شجر کے نیچے آرام کرنا چاہتی تھی۔

آفس کا سارا بوجھ ابھی تک اس کے کندھوں پر تھا۔ جو کہ اب اس کے لیے اٹھانا دشوار ہو گیا تھا۔

وہ فائل بہت اہم تھی جس پر وہ بڑی دیر سے سر کھپا رہی تھی اور لمحہ بہ لمحہ اس کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پھر اس کا ضبط جواب دے گیا تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ایک عزم کے ساتھ فائل اٹھائے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اعتماد سے قدم جماتی وہ اس کے عین سامنے آن کھڑی ہوئی تو اس نے بڑے کڑے تیوروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی فرمائیے۔'' اس نے کھا جانے والے انداز میں پوچھا تو وہ ٹیبل کی سائیڈ سے ہوتی ہوئی اس کے دائیں طرف آن کھڑی ہوئی۔

''سر یہ فائل دیکھ لیں۔'' اس نے فائل کھول کر اس کے سامنے رکھ دی۔

''مجھے کچھ نہیں دیکھنا لے جاؤ اسے یہاں سے۔'' اس نے فائل کو بند کر کے اس کے سامنے پٹخ دیا۔

''آئی ایم سوری سر' یہ میری ذمہ داری نہیں اب میں مزید یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتی آج آپ کو یہ سب کرنا پڑے گا۔'' اس نے اٹل لہجے میں کہا۔

''میں نے کہا نا مجھے کچھ نہیں سننا چلی جاؤ یہاں سے۔''

''ٹھیک ہے سر میں چلی جاؤں گی لیکن آپ کی ذمہ داریاں آپ کو سونپ کر۔ ہم برسوں کی محنت کو دنوں میں ختم نہیں کر سکتے۔'' اس نے دوبارہ فائل اس کے سامنے کھول دی۔

''آخر تم لوگ کس بات کی تنخواہ لیتے ہو۔''

''سر آپ اپنی ذمہ داریاں اٹھائیں مجھے تنخواہ کی ضرورت نہیں ہے میں بہت جلد چلی جاؤں گی اسی لیے میں آج یہ سب کچھ آپ کے حوالے کرنے آئی ہوں۔''

''زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ جیسے اس کے جانے کی بات سن کر سلگ اٹھا۔

''پھر آپ بھی خاموشی سے میری بات سنیں۔'' اور اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ کچھ بولتا اس نے اپنی بات شروع کر دی جو کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سننے پر مجبور تھا۔ وہ ایسے ایسے مسائل اس کے سامنے لا رہی تھی کہ وہ ان سے نظریں نہیں چرا سکتا تھا۔ اور پھر وہ کافی دیر ان مسائل پر ڈسکس کرتے رہے تقریباً ایک گھنٹہ بعد باقی اسٹاف کو بھی طلب کر لیا گیا اور یہ موجودہ حالات میں ایک بے حد اہم میٹنگ تھی۔ تنویہ نے آج ایک بہت بڑا پہاڑ سر کر لیا تھا۔

وہ روزانہ آتا تھا تو آنکھیں بند کر کے نہیں آتا تھا وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ کس طرح سب لوگوں نے ایک دوسرے کی ذمہ داریاں بانٹ رکھیں تھیں۔ اور کتنی خوش اسلوبی سے ہر کام انجام دیا جا رہا تھا۔ کمپنی کے لیے اس کی بھاگ دوڑ بھی

اس کے سامنے تھی اور کچھ رحمت کی زبانی بھی گذشتہ حالات کی تفصیل وہ سن چکا تھا کہ کس طرح انھوں نے اس کی خاطر قربانیاں دی تھیں۔ جن میں سرفہرست تذکرہ تنوینہ کا ہی تھا اور ان سب باتوں کے بعد اس کی بدگمانی کی کچھ گرد دھلی تھی۔

''آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ بلکہ آپ کے خلوص کے سامنے یہ لفظ بالکل بے معنی ہے جس طرح آپ نے اس مشکل وقت میں مجھے اور میرے بزنس کو سہارا دیا ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے یا شاید کہیں نہیں ملتی۔''

''نو سر ایسا نہ کہیں اور اگر شکریہ ادا کرنا ہے تو مس تنوینہ کا کیجیے کیونکہ اگر یہ قدم نہ بڑھاتیں تو یقیناً ہم بہت پیچھے رہ جاتے۔'' تنویر نے کہا۔

''نہیں میں نے کچھ نہیں کیا۔ کیونکہ اگر آپ سب کی مدد ساتھ نہ ہوتی تو میں اکیلی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔'' اس نے خود کو موضوع گفتگو بنتے دیکھ کر دامن بچایا۔

''بہرحال آپ سب اس کمپنی کے لیے ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

''سر میرا خیال ہے کہ اب ہم میں مزید لوگوں کا اضافہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ کام زیادہ ہے اور ورکرز کم۔'' یہ مشورہ تھا۔

''ٹھیک ہے اپنے جیسے باصلاحیت اور پرخلوص لوگ تلاش کریں۔''

''سر ہال کمرے کے ورکرز میں کچھ باصلاحیت لڑکے اور لڑکیاں ہیں میری نظر میں۔'' تانیہ نے کہا اور پھر ان کے نام پیش کر دیئے۔

''تو ٹھیک ہے پھر چیک کر لیتے ہیں۔ اور ہاں تنویر اور سرمد اب آپ کو فیکٹری کا باقاعدہ انچارج بننا پڑے گا۔''

''لیکن سر ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ وہاں کا چارج آپ سنبھالیں اور یہاں کی ذمہ داری مس تنوینہ کے سپرد کر دیں۔'' تنویر نے کہا تو وہ فوراً بولی۔

''نہیں اب میں یہ ذمہ داری قبول نہیں کر سکتی۔'' اس کے کہنے پر اس نے اس کی طرف صرف دیکھا ہی تھا۔

''بہرحال دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔'' اس نے بات ختم کی۔

میٹنگ کے اختتام پر سب اٹھنے لگے تو وہ سب سے پہلے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ ابھی کچھ دیر رکیں گی مس تنوینہ؟'' اس کے کہنے پر وہ متذبذب سی دوبارہ بیٹھ گئی اور باقی سب باری باری نکل گئے۔

''ہاں اب بولو تم کہاں جا رہی ہو؟'' ریوالونگ چیئر پر بیٹھے بیٹھے اس کی طرف رخ موڑ کر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''جہاں بھی جاؤں آپ کی بلا سے۔'' اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے انتہائی بے نیازی سے جواب دیا۔

''میرے سامنے زیادہ شو آف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ جا کر اپنی سیٹ سنبھالو۔'' اس نے کھوکھلے سے رعب کے ساتھ کہا تو اس کے انداز پر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی جسے چھپانے کے لیے وہ جلدی سے اٹھ گئی۔

اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے گہری اور پرسکون سانس لی۔ آج اس کے کندھوں سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ لیکن ان دنوں کی انا کے بت آج بھی اپنی اپنی جگہ بڑی آن بان سے کھڑے تھے۔

اس کے ہونٹوں پر کھیلتی گہری اور مطمئن مسکراہٹ تانیہ کی تیز نظروں سے چھپی نہ رہ سکی۔

''سچ سچ بتانا وینہ آج کیا پڑھ کر پھونکا تھا ارسل منصور پر۔''

''گذشتہ اور آنے والے مسائل کا دم۔''
اس نے برجستہ جواب دیا۔
''تانی انسان چاہے جو مرضی کہتا رہے لیکن جیتے جی وہ اپنے حق سے دستبردار ہوسکتا ہے اپنے کاروبار سے نظریں نہیں چرا سکتا۔''
''تمہیں بھی ان محنتوں کا کچھ صلا ملا یا نہیں؟'' اس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔
''شٹ اپ۔تم سب سے علیحدہ محنت نہیں کی میں نے۔'' اس نے کہا لیکن اس کی خوبصورت مسکراہٹ چغلی کھا رہی تھی کہ کہیں نہ کہیں کچھ ہوا تو ضرور ہے۔

.....

سر یہ ہماری شادی کا کارڈ ہے۔ اور آپ آنٹی کو ساتھ لے کر ضرور آیئے گا۔''
''تمہیں بہت بہت مبارک ہو تنویر کہ تم اپنے من چاہے ساتھی کے ساتھ اپنی زندگی کا نیا سفر شروع کر رہے ہو۔'' اس نے کارڈ پڑھ کر دوبارہ لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا۔
''تھینکیو سر اور میری دعا ہے سر کہ آپ کی تنہائیوں کا ساتھی بھی آپ کا من چاہا ہو۔'' اس نے پرخلوص دعا دی تو وہ استہزائیہ سے انداز میں مسکرا دیا۔
''کبھی کبھی من کی چاہتیں بڑی عجیب ہوتی ہیں تنویر کہ جنھیں ذہن قبول نہیں کرتا۔''
''چاہتیں تو بہتا دھارا ہیں سر چاہے جتنے مرضی بندھ باندھو یہ قابو میں نہیں آتیں۔''
''ہاں شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔'' وہ گہری سانس لے کر بڑبڑایا۔
''وینہ کی بچی اگر تو نے تمام فنکشنز اٹینڈ نہ کیے تو پھر دیکھنا مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''
''لیکن تانی رات کے تمام فنکشنز میں کس طرح اٹینڈ کر سکتی ہوں خود تو تم نے دو مہینے کی چھٹیاں لے لیں تو میں رات بھر جاگ کر یہاں آ کر ڈیوٹی کیسے کروں گی؟''
''ایسا کرو تم بھی ایک ہفتے کی چھٹیاں لے لو۔''
''ہاں جیسے میری ہی تو اجارہ داری ہے یہاں پر۔''
''مجھے نہیں معلوم تمہیں ہر ممکن شادی میں شرکت کرنا ہے۔''
لیکن کچھ ہوا یوں کہ اچانک ہی اماں کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اور دو دنوں میں ہی حالت اتنی خراب ہوئی کہ انھیں ہسپتال ایڈمٹ کروانا پڑا۔ زین کے فائنل ایگزام ہو رہے تھے۔ اس لیے سارا دن تو نائمہ اماں کے پاس ہوتی اور رات کو وہ وہاں ڈیوٹی دیتی۔
اماں کی زندگی اسے بے حد عزیز تھی اس لیے وہ انھیں شہر کے بہترین ہسپتال میں لائی تھی۔ جہاں ان کا علاج بڑی توجہ سے ہو رہا تھا۔
تقریباً ایک ہفتہ ہسپتال رہنے کے بعد وہ گھر آئیں تو پہلے سے کافی بہتر تھیں۔ شادی کے بعد تانیہ اور تنویر دونوں ہی ان کی عیادت کے لیے آئے تھے۔

.....

تانیہ اور تنویر کی چھٹیوں کی وجہ سے ایک دفعہ پھر ذمہ داریوں کا بوجھ اس پر آ پڑا تھا لیکن اتنا نہیں کہ بدحواس ہو جاتی۔ اسٹاف میں اضافے کی وجہ سے کام کا بوجھ کم ہوگیا۔ البتہ ارسل کے ساتھ اسے بہت سی اہم میٹنگ میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ اور اس روز بھی وہ کسی میٹنگ سے واپس آ رہے تھے۔ ہونٹوں پر ہونٹ جمائے وہ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ بھی خاموشی سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھی گزرتے مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ گاڑی کی رفتار ایکدم تیز ہوگئی تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر پھیلا اضطراب

اس کی اندر کی کیفیت کو واضح کر رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار مزید تیز ہو گئی تھی وہ خوف زدہ سی نگاہوں سے سڑکوں پر پھیلے رش کو دیکھنے لگی۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟''

سپیڈ انتہائی حدوں پر پہنچ گئی تو وہ چیخ اٹھی۔

لیکن وہ لب بھینچے بیٹھا رہا۔ آج بہت عرصے بعد اضطراب اس پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس کی یہ کیفیت بہت دنوں بعد دیکھی تھی اس نے وہ گاڑی کو قدرے سنسان سڑک پر لے آیا تھا۔

وہ اس کی لحہ بہ لحہ بدلتی حالت کو دیکھ رہی تھی۔ وہ گاڑی کو اپنے اندر اٹھتے طوفان کی طرح ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ کبھی سپیڈ تیز ہو جاتی اور کبھی اتنی آہستہ کہ ایسا لگتا ابھی گاڑی رک جائے گی۔ لیکن پھر جیسے اس پر جنون طاری ہو گیا وہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی خود کو کنٹرول نہیں کر سکا تھا۔

''ارسل صاحب پلیز کیا کر رہے ہیں آپ؟'' وہ چلائی۔

''کیوں کیا بہت ڈر لگتا ہے؟'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''پلیز رفتار آہستہ کریں۔''

''کیوں؟''

''مجھے آپ کے ساتھ مرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' وہ تیز لہجے میں بولی تو فل سپیڈ گاڑی کو ایکدم بریک لگ گئی۔ احتجاجاً گاڑی کے ٹائر بھی پوری قوت سے چلائے۔

''اترو نیچے۔''

''کیوں......؟'' وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''اترو۔'' اس کے لہجے میں ایسی کڑک تھی کہ وہ مشینی انداز میں دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور اگلے ہی لمحے وہ گاڑی اڑا لے گیا اور وہ غصے کی حالت میں لب بھینچے اڑتی دھول کو دیکھتی رہ گئی۔

اے۔سی گاڑی سے باہر آتے ہی اسے شدت سے گرمی کا احساس ہوا تھا۔ جھلملاتی دھوپ سے بچنے کے لیے وہ روڈ سے قدرے ہٹ کر کھڑے درخت کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی نظریں سنسان سڑک کا دور تک جائزہ لے کر واپس آ گئیں۔ اسے وہاں کھڑے ہوئے تقریباً پندرہ بیس منٹ ہو چکے تھے اور وہ پسینے سے بری طرح بھیگ گئی تھی اسے رہ رہ کر ارسل منصور پر غصہ آ رہا تھا۔

کب تک آخر کب تک لڑو گے خود سے ارسل منصور آخر ایک دن تو ایسا آئے گا کہ۔'' دور سے آتے رکشے کو روک کر وہ بیٹھ گئی اور گھر کا ایڈریس سمجھا دیا۔ اس وقت وہ آفس نہیں جانا چاہتی تھی۔

....

اٹھی گرتی پلکوں کو وہ اتنی دیر سے اپنی نظروں کے حصار میں لیے بیٹھا تھا۔

وہ کافی دیر سے اسے ڈکٹیشن دینے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ حالانکہ یہ کام اب اس کے سٹینڈرڈ کا نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ اس سے کرواتا تھا۔ لیکن وہ آج پھر کچھ گیا تھا۔ کبھی چیئر پر بیٹھ جاتا تو تھوڑی دیر بعد اٹھ کھڑا ہوتا۔ بولتے بولتے بھول جاتا کہ کیا کہہ رہا تھا۔ سوچ چپ کر جاتا۔

اسے یہاں بیٹھے تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی تک ایک لفظ بھی پلے نہ پڑا تھا کہ کیا لکھے۔ اس لیے وہ نظریں جھکائے خاموش بیٹھی ڈائری پر الٹی سیدھی لائنیں کھینچ رہی تھی۔ جب وہ خود بھی ادھر سے ادھر ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تو اپنی چیئر پر ڈھے سا گیا۔

اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ گنگ ہو گیا تھا۔ اور اب اس کی تیز نگاہوں کی تپش اسے جھلسائے دے رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بھاگ جانا

چاہتی تھی۔ لیکن وہ بھاگ کر جہاں بھی چلی جاتی وجود میں گڑھتی یہ دو نگاہیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتیں تھیں۔ لہذا وہ بیٹھی رہی کہ شاید آج خود پرستی کا خول کہیں سے چٹخ جائے۔ لیکن انتظار کے لمحے طویل ہو گئے تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب ان نظروں کو برداشت کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ ڈائری اور پین ٹیبل پر رکھا اور مڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔

وہ اس کے اس طرح اٹھنے پر چونک گیا۔ اور اس کے کمرے سے نکلتے ہی گہری سانس لے کر پین اور ڈائری اپنی جانب کھسکالی اور پہلے ہی صفحے پر لکھی تحریر کو پڑھ کر لب بھینچ کر زبردستی در آنے والی مسکراہٹ کو روکا۔ ورق پھاڑ کر ٹیبل کی دراز میں رکھا اور بیل بجا کر رحمت کو بلایا۔

''تنویر صاحب کو بھیجو۔''

فائلوں کو ادھر ادھر پٹختے وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

''سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو' کیا میں اتنی ہی گری پڑی ہوں۔''

''تف ہے تم پر بھی تنوینہ حیدر جو تم اتنی دیر وہاں بیٹھی رہیں۔ کہاں گئی تمہاری وہ انا وہ خودداری۔ کیوں بھسم ہو جانی ہو اس کے سامنے کیوں منتظر ہو اس بات کی جو ناممکن ہے' تمام حقائق سے باخبر ہونے کے باوجود کیوں آگ میں چھلانگ لگا رہی ہو؟''

''وینہ یار! اندر کا غصہ کیوں ان بیچاری بے جان فائلوں پر نکال رہی ہو؟''

یہ تانیہ تھی ابھی دو دن پہلے ہی لوٹی تھی۔ ہنی مون ٹریپ سے' اس کے شرارت آمیز لہجے پر وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ پہلے کی نسبت بہت زیادہ خوبصورت ہو رہی تھی۔

''کتنے خوبصورت ہوتے ہیں ان خوشیوں کے رنگ۔'' وہ سوچ کر رہ گئی۔

''تنویر صاحب آپ کو صاحب بلا رہے ہیں۔'' تنویر جو کہ وہیں بیٹھا تھا رحمت نے آ کر پیغام دیا تو وہ کچھ یاد آنے پر ایکدم چونک کر کھڑی ہو گئی۔ اتنے میں تنویر بھی جانے کے لیے کھڑا ہو چکا تھا۔

''ایک منٹ تنویر ٹھہرو میں ابھی آئی۔'' وہ یہ کہہ کر تیزی سے نکل گئی۔

اس کی ٹیبل کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا ڈائری اور پین وہ جس طرح چھوڑ گئی تھی ویسے ہی رکھے تھے۔ لیکن اوپر کا ورق جس پر وہ لکھتی رہی تھی غائب تھا۔ اس نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور الٹے قدموں لوٹنے لگی۔

''سنو۔'' اس کی آواز پر اس کے قدم وہیں جم گئے وہ مڑی نہیں۔

''یہیں لینے آئی تھیں ناں تم؟'' اس نے ڈائری کا وہ کاغذ اس کی آنکھوں کے سامنے رکھ دیا تو اپنے ہی لکھے جملوں پر اس کی نظریں پھسل گئیں۔

''لگتا ہے آج پھر ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ انھیں اپنے دماغ کا علاج کروانا چاہیے۔ آنکھیں تو جیسے پتھرا گئی ہیں انھیں کسی آئی سپیشلسٹ سے رجوع کرنا چاہیے۔'' اس نے ایک نظر میں سارا پڑھ لیا اور پھر اس سے نظر ملائے بغیر اس کی سائیڈ سے ہوتی باہر نکل گئی۔ حماقت تو ہو چکی تھی۔

.....

''پرل کانٹینینٹل میں فارنرز کی ایک بہت اہم میٹنگ ہے جسے ہمارے ملک کے مایہ ناز تاجر راجہ اینڈ سنز نے ارینج کیا ہے۔ چونکہ انویٹیشن کارڈ ہمیں بھی موصول ہوا ہے اور کمپنی کو ترقی دینے کے لیے ہمارے پاس یہ ایک بہترین موقع ہے اور مجھے آپ میں سے ایک ایسا ساتھی درکار ہے جو وہاں پوری طرح ترجمانی کر سکے۔ اب وہ

کون ہو آپ رائے دیں۔'' ارسل اپنے سٹاف کے سامنے بیٹھا پوچھ رہا تھا۔

''آپ کے لیے بہترین ساتھی تو مس تنویہ ہی ہو سکتی ہیں سر۔'' تنویر نے جملہ تو بڑے نارمل لہجے میں ادا کیا تھا لیکن اس کی بات سے جھلکتی معنی خیزی پر ارسل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں سر میں نے کچھ غلط کہا؟'' وہ اب بھی سنجیدہ تھا۔

''ہوں۔'' کہہ کر اس کی نظر تنویہ کی طرف اٹھ گئی۔

''آئی ایم سوری سر میں اتنی رات گئے کے فنکشن اٹینڈ نہیں کر سکتی۔'' وہ بھی کم نہ تھی۔

''آپ تانیہ اور تنویر میں سے کسی کو لے جائیں۔'' اس نے جواب دے کر ساتھ ہی مشورہ دیا لیکن اسے اس کا یہ دوٹوک انداز پسند نہ آیا۔

''سوری مس میں تنویہ' دن ہو یا رات ڈیوٹی از ڈیوٹی۔ ذہنی طور پر خود کو تیار کر لیں کہ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے۔'' اس کا انداز بھی فیصلہ کن تھا۔ وہ متذبذب نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اور پھر باقی سب کے ساتھ لب کاٹتی کھڑی ہو گئی۔ باہر نکل کر وہ تانیہ سے الجھ پڑی۔

''تانی تم سمجھنے کی کوشش کرو اتنی رات گئے میں اکیلی.....؟''

''شٹ اپ یار کیوں بزدلوں جیسی باتیں کر رہی ہو اور کیا پہلی دفعہ جا رہی ہو اس کے ساتھ جو تم فضول کے واہموں میں گھری ہو۔''

''پہلی دفعہ نہیں جا رہی اس لیے تو کہہ رہی ہوں۔ پھر یہ دوپہر میں اگر سنسان راہوں میں چھوڑ کر آ سکتا ہے تو آدھی رات کو کیا بعید۔'' وہ تانیہ کو اس دن کا واقعہ بتا چکی تھی۔

''اس وہم کو دل سے نکال دو کہ وہ تمہیں چھوڑ سکتا ہے اور اگر چھوڑ بھی جائے تو یہ یقین رکھو کہ لوٹ کر تمہاری طرف ہی آئے گا۔

''وقت بے وقت فضول بکواس نہ کرتی رہا کرو تم۔''

''ٹھیک ہے نہیں کرتی لیکن تم فنکشن میں جانے کے لیے تیار کر رہنا۔''

اور شام کو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جانے کے لیے کہاں رہ گی۔ نائمہ نے تیاری میں اس کی بھرپور مدد کی۔ بلیک سوٹ پر لگے ملٹی شیڈ رنگوں سے میچ جیولری وہ لے آئی۔

''آپا یہ بھی پہن لیں۔''

''نیمی میں میٹنگ میں جا رہی ہوں شادی میں نہیں۔''

''آپا چھوٹے چھوٹے سے تو ٹاپس ہیں اور یہ رنگ تو آپ کی نازک سی انگلی میں بہت سجے گی۔'' اس نے انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈالتے ہوئے کہا اور اس کا کہنا سچ ثابت ہوا تھا اور پھر اس نے چپکے سے اس کے پیچھے کھڑے ہو کر چھوٹے چھوٹے موتیوں والی بلیک ملٹی شیڈز باریک سی مالا اس کے گلے میں ڈال دی جو کہ اس کی صراحی دار سفید گردن پر دمک اٹھی۔

''ارے یہ کیا؟''

''دیکھیں آپا کتنی سوٹ کر رہی ہے۔'' اور پھر خوبصورت گلابی ہونٹوں پر براؤن لپ اسٹک اور آئی لائنر کے بعد کاجل کی لکیر نے اس کی جادوئی آنکھوں کو مزید نکھار دیا۔

آج بہت عرصے بعد وہ اتنے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ آئینے میں ایک لمحے کو تو وہ بھی خود نہ پہچان پائی تھی۔

''آپا بال کھلے رہنے دیں۔''

''نہیں مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' اس نے سختی سے کہا اور لمبے بالوں کی آدھی چٹیا بنا کر بلیک موتیوں کی پونی ڈالی۔ اور لباس سے ہم رنگ نازک سے سینڈل پہن کر وہ بالکل تیار تھی۔

وہ اپنا تنقیدی جائزہ لے کر رسٹ واچ پر ٹائم دیکھتی کمرے سے باہر آ گئی۔

''ماشاء اللہ میری بچی کو نظر نہ لگ جائے۔'' اماں نے مامتا سے بھرپور لہجے میں کہا اور کچھ پڑھ کر پھونکنے لگیں۔

''اماں بس کریں کچھ نہیں ہوتا مجھے۔'' وہ شرما سی گئی۔اس وقت گاڑی کا ہارن بجا اور وہ سب کو خدا حافظ کہتی باہر آ گئی۔

ڈرائیور نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ ڈرائیور کی ڈیوٹی صرف آفس تک تھی۔ لہذا آفس کی پارکنگ میں گاڑی روک کر وہ اندر چلا گیا۔ وہ وہیں بیٹھی رہی۔ چند منٹوں بعد وہ واپس آیا تو کھڑکی میں جھک کر اس نے کچھ کہا اور اس کے اثابت میں سر ہلانے پر سلام کر کے چلا گیا۔ اس نے وقت دیکھا تو ساڑھے نو ہو چکے تھے اور پارٹی کا وقت دس بجے تھا اور ابھی ایک گھنٹے کی ڈرائیور کے بعد انھیں وہاں پہنچنا تھا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد وہ آفس سے باہر آیا۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں اس کی شاندار پرسنالٹی مزید نکھر گئی تھی۔ اس کے ہر اٹھتے قدم کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں تو وہ نظریں پھر کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''میں تمہارا ڈرائیور نہیں کہ تمہیں اس طرح لے جاؤں۔''

اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے اس کے پیچھے بیٹھے رہنے پر اعتراض کیا تھا۔ اور فرنٹ ڈور کھولنے پر وہ اس کے برابر آن بیٹھی اس نے صرف ایک نظر اس پر ڈالی تھی۔ اور گاڑی اسٹارٹ کر کے دوڑ پڑے۔ سڑکوں پر زندگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ رواں دواں تھی۔

''شکر ہے تمہیں بھی کسی پارٹی کو اٹینڈ کرنے کے ایٹی کیٹس معلوم ہیں۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا تم ان سب چیزوں سے نابلد ہو۔''

معلوم نہیں کہ اس نے اس کی معمول کی سادگی پر چوٹ کی تھی یا اس وقت کی خوبصورتی کو سراہا تھا وہ کچھ سمجھ نہ سکی۔ اس لیے خاموشی سے کھڑکی کے پار دیکھنے لگی اور باقی تمام رستہ خاموشی کی نذر ہو گیا۔

گاڑی سے نکل کر اس نے اپنی طرف کا دروازہ بند کرتے ہوئے اپنے اردگرد کا بھرپور جائزہ لیا تھا جبکہ ارسل کی نگاہیں اس کے خوبصورت سراپے میں الجھ کر رہ گئی۔ بڑی بڑی لائٹوں کی دودھیا روشنی نے اس کے حسن کو دوآتشہ بنا دیا تھا۔

''روشنیاں کیا پہلی بار دیکھیں ہیں جو یوں ٹائم ضائع کر رہی ہو؟'' نگاہوں میں ستائش کے باوجود وہ اکھڑ لہجے میں ہی مخاطب ہوا تو وہ اندر ہی اندر کٹ کر رہ گئی کہ وہ تو اس کی نظروں سے بچنے کے لیے ہی خود کو بے نیاز ظاہر کر رہی تھی۔

اس نے قدم بڑھائے تو وہ اس کے پیچھے ہو لی۔ گارڈ نے انویٹیشن کارڈ دیکھ کر انھیں اندر جانے دیا۔ راجہ اینڈ مسز راجہ نے انھیں خوشدلی سے ویلکم کہا۔ راجہ صاحب چونکہ منصور صاحب کے دیرینہ دوستوں میں سے تھے اس لیے ارسل کو دیکھتے ہی گلے لگا لیا۔ اور گلہ کیا۔

''ارے بیٹا چپکے چپکے شادی رچا ڈالی اور ہمیں بلانا تو دور کی بات خبر تک نہ کی۔''

''نو انکل چپکے چپکے شادی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب بھی شادی کی' ڈنکے کی چوٹ پر کروں گا۔ اور سب سے پہلا کارڈ آپ کو بھجواؤں گا۔'' اس نے ہنستے جواب دیا اور ساتھ ہی تنویہ کا تعارف کروایا۔

''آئی ایم سوری بیٹا ایسی غلط فہمیاں اکثر ہو جاتی ہیں۔'' اور پھر ارسل جیسے بندے کے ساتھ کوئی لڑکی دیکھ کر'' انھوں نے تنویہ سے معذرت کی اور ساتھ ہی اس کے مضبوط کردار کی

گواہی دی۔ لیکن وہ صرف پروقار انداز میں ہلکا سا مسکرائی تھی۔

وہ آگے بڑھے تو راجہ صاحب کے چھوٹے بیٹے جس کی عمر یقیناً تیس سے بھی کچھ اوپر ہی ہوگی نے انھیں ریسیو کیا اوخوشدلی سے باتیں کرتا ہوا نشست گاہوں کی طرف لے آیا۔ کافی مہمان آ چکے تھے لیکن شاید ابھی اور آنا باقی تھے۔ یہاں غیر ملکیوں کے ساتھ ساتھ پاکستانی بھی کافی تعداد میں موجود تھے ایسا لگتا تھا جیسے دنیا کے تمام بزنس مین آج یہاں ہی اکھٹے ہوں۔

ارسل تو جلد اپنے ملنے والوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہوگیا۔ البتہ وہ اپنی جگہ پر خاموش بیٹھی کولڈ ڈرنک کے سپ لیتی رہی۔ لیکن چونکہ اسے بھی کاروباری دنیا میں قدم رکھے کافی عرصہ ہو چکا تھا اس لیے اسے بھی جلد ہی کمپنی مل گئی اور شاید کچھ اس کی اپنی شخصیت کا چار تھا کہ اسے مرکز نگاہ بننے میں دیر نہ لگی۔

''ارسل آپ کی مسز بہت خوبصورت ہیں۔'' وہ اس وقت ملکی و غیر ملکی گروپ میں کھڑا تھا۔

اس نے کہنے والے کی بات کی تردید نہیں کی بلکہ دور کھڑی کسی خاتون کے ساتھ باتیں کرتی تنوینہ کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

''شاید حد سے زیادہ محتاط اور مشرقی ہیں بہت ڈھونڈ کر ہیرا چنا ہے آپ نے۔''

وہ اس پر نظریں جمائے تبصرہ کر رہے تھے۔ اور وہ کہ جس نے ابھی تھوڑی دیر قبل دل ہی دل میں اس کی خوبصورتی کو سراہا تھا۔ اب یوں کسی کا اس پر تبصرہ کرنا ناگوار لگنے لگا۔ یہ نہیں تھا کہ اس نے خود کو مرکز نگاہ بنانے یا خود کو نمایاں کرنے کے لیے بہت محنت کی تھی۔ بلکہ یہ اس کی اپنی شخصیت کا ایک مخصوص رکھ رکھاؤ تھا جو اسے سب میں نمایاں کر رہا تھا۔ جبکہ اس کی نسبت یہاں موجود خواتین نے فیشن کی حدوں کو چھوا ہوا تھا۔ اور عریاں ہوتے جسم کی نمائش میں فخر محسوس کر رہی تھیں۔

''اگر ان کی مسز ہیرا ہیں تو یہ خود کیا کسی سے کم ہیں۔'' ایک غیر ملکی عورت نے اس کی بھرپور مردانہ وجاہت کو بڑی گہری نظروں سے دیکھا تو باقی اردگرد کھڑے لوگ اس کی نظروں کا مطلب سمجھ کر ہنس دیئے جس میں ارسل کی بھی خفیف سی ہنسی شامل تھی۔

تین گھنٹے کی طویل میٹنگ کے بعد کھانا سرو کیا گیا تھا۔

''انکل میرا خیال ہے اب ہمیں بھی اجازت دیں۔'' راجہ صاحب مہمانوں کو سی آف کر رہے تھے جب تنوینہ کو لیے وہ بھی ان کے پاس چلا آیا۔

''رائٹ بیٹا کبھی گھر چکر لگاؤں ناں منصور کے بعد تو تم نے بالکل ہی تعلقات ختم کر دیئے ہیں۔''

''ارے نہیں انکل پاپا کے بعد مصروفیت ہی کچھ اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ ٹائم ہی نہیں ملتا۔''

''ہاں بزنس کا بوجھ بھی تو اب سارا تمہارے کندھوں پر ہے۔ لیکن یار میل جول سے اپنا ہی فائدہ ہوتا ہے۔''

''اوکے انکل آنٹی خدا حافظ۔'' اس نے تنوینہ کے بار بار ریسٹ واچ دیکھنے پر جلدی سے بات ختم کی اور مصافحہ کرتے آگے بڑھ گیا۔

''بہت ذہین اور قابل لڑکا ہے دیکھنا یہ بہت آگے تک جائے گا۔'' انھوں نے اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے اپنے برابر کھڑی بیوی اور بیٹوں کے سامنے اس کی تعریف کی۔ اسی وقت ان کا سب سے چھوٹا بیٹا فرحان بھی قریب آ گیا۔

''جی ہاں پاپا اور ان کی مسز بھی بہت قابل اور ذہین ہیں بزنس کی بہت سمجھ بوجھ رکھتی ہیں۔''

اس نے کہا تو دونوں میاں بیوی اس کی بات پر ہنس دیئے۔ لیکن اسی وقت کچھ اور مہمان ان کے قریب چلے آئے اور بات آئی گئی ہوئی۔

واپسی پر دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کا موضوع آج کی میٹنگ ہی تھا۔ جس پر دونوں اپنا اپنا اظہار خیال کر رہے تھے۔

''یہ گاڑی کدھر لے جا رہے ہیں آپ مجھے آفس نہیں گھر جانا ہے۔''

''او سوری باتوں میں مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ بتاؤ کدھر جانا ہے؟'' اس کے کہنے پر اس نے راستہ بتایا۔

''بس یہیں روک دیں۔'' اس نے گھر سے کافی فاصلے پر گاڑی رکوادی۔

''کیوں گھر تک جانے میں کیا قباحت ہے؟''

''یوں تو کوئی نہیں لیکن میری اماں بہت مہمان نواز ہیں آپ اگر وہاں تک گئے تو آپ کو گھر کے اندر بھی جانا پڑے گا۔ اور چائے کا ایک کپ بھی پینا پڑے گا جو کہ شاید آپ کی شایان شان نہ ہو۔'' اس کے کہنے پر اس نے بھی کچھ کہنے کے لیے لب کھولے اور پھر سختی سے بھینچ لیے۔

''او کے سر خدا حافظ۔'' اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ لیکن پھر کچھ یاد آنے پر اس کی طرف مڑی۔

''تھینکیو..... تھینکیو ویری مچ۔'' اس کے لہجے کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں بھی تشکر تھا۔ وہ حیرانگی سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ گاڑی سے باہر نکلی تو گھپ اندھیرے نے اس کا استقبال کیا۔ گاڑی کی لائٹس کے علاوہ بس کہیں کہیں بھی سٹریٹ لائٹس کی روشنی تھی۔

رات کے بارہ بجے کا وقت اور اور ایک تنہا لڑکی گاڑی سے نکل کر جا رہی تھی۔

''اگر کوئی دیکھ لے تو؟'' اس نے ایکدم جھرجھری لی۔ البتہ آج اس کا واقعی دل چاہا تھا کہ وہ اس کے کردار کی عظمت کو سلام کرے۔ وہ تہہ دل سے اس کی شکر گزار تھی۔ عورت بظاہر جتنی بھی طاقتور اور مضبوط نظر آئے لیکن اندر سے بہت کمزور اور کھوکھلی ہوتی ہے ابھی وہ گلی کا موڑ مڑی تھی کہ ذین مل گیا۔

''تھینکس گاڈ آپ آ گئیں۔'' اماں نے نجانے کتنے چکر لگوائے ہیں۔ اور جب وہ گھر پہنچی تو اماں نے سکون کا سانس لیا۔

.....

وہ اس وقت اسپیشل بزنس نیوز میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی کہ جس میں اس دن کی اہم میٹنگ کی تفصیلات و تصاویر کے ساتھ شرکاء کے ناموں کی فہرست بھی شائع ہوئی تھی اور پھر اپنا نام پڑھ کر اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔

''یہ کیا ہے سر؟'' اس نے میگزین اس کے سامنے لا پٹخا تو وہ ایک نظر اس پر ڈال کر میگزین دیکھنے لگا۔ حالانکہ وہ بڑی تفصیل سے اس کا مطالعہ پہلے ہی کر چکا تھا۔

''کیا دکھانا چاہ رہی ہیں آپ؟'' اس نے سنجیدہ ہونے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا تو اس کا جی چاہا کہ یا تو اپنا سر پھاڑ لے یا پھر اس کا۔

''لسٹ دیکھیں۔'' اس نے دانت کچکچا کر کہا۔

''ہوں مسٹر اینڈ مسز ارسل منصور۔'' وہ اس طرح بڑبڑایا کہ وہ بہ آسانی سن سکے۔ اور ساتھ ہی ہونٹوں پر در آنے والی بے ساختہ مسکراہٹ کو نہ روک سکا۔

''تو اب اس میں میرا کیا قصور ہے مس تنویہ میں نے تو وہاں آپ کے سامنے ہی اس بات کی تردید کی تھی۔ لیکن اگر وہ پھر بھی اس غلط

ہمی کا شکار ہو گئے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔'' وہ ایزی ہو کر بیٹھتے ہوئے کچھ سنجیدگی سے بولا۔

''لیکن میں ایسی غلط فہمیاں افورڈ نہیں کر کتی سر۔'' وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی۔

''تو پھر اب میں کیا کر سکتا ہوں؟'' اس نے میگزین اس کی طرف پھینکا۔

''آپ ان کے دفتر فون کر کے اس غلط فہمی کی تردید تو کر سکتے ہیں۔''

''آئی ایم سوری تنوینہ میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے۔ اور پھر میں کس کس کے دفتر فون کر کے بتاؤں کہ آپ میری مسز نہیں ہیں۔'' ایک نظر اس پر ڈالی اور بولا۔

''دوسروں کو خواہ مخواہ اپنی طرف متوجہ کروانے کا کوئی فائدہ نہیں' اور ویسے بھی اس میں اعتراض کی تو کوئی بات نہیں ہے اس میں آپ کا نام تو نہیں آیا ناں۔ مسز ارسل منصور ہی لکھا ہے۔'' وہ ایک دفعہ پھر محظوظ سے انداز میں مسکرا دیا تو اس کی یہ مسکراہٹ اسے مزید چڑا گئی۔

کچھ دنوں سے تو ویسے بھی اس کے ہونٹوں پر بجی مطمئن و خوبصورت سی مسکراہٹ جو کہ بات بے بات گہری ہو جاتی تھی اسے کنفیوژ کیے ہوئے تھی۔

وہ میگزین اٹھا کر پاؤں پٹختی اپنی سیٹ پر آ گئی۔ اور نمبر دیکھ کر ریسیور اٹھایا اور نمبر ملا دیا۔ دوسری طرف راجہ صاحب کا بیٹا فرحان تھا۔ اور پھر اس نے تعارف کے بعد اپنا مدعا بیان کیا تو جسے وہ حیرت سے اچھل ہی تو پڑا ہو۔

''رئیلی۔'' وہ بے یقینی سے بولا۔

''یو آر شیور کہ آپ کی ارسل منصور کے ساتھ ایسی کوئی ریلیشن شپ نہیں اور نہ ہی ایسی کمنٹ منٹ ہے؟'' اس نے دوبارہ تصدیق چاہی۔

''جی ہاں۔'' اس نے کاٹ دار لہجے میں جواب دیا۔

''او آئی سی۔'' اس کا انداز سوچتا ہوا تھا۔

''اینی وے آئی ایم ویری ہیپی کیونکہ میرے لیے یہ بہت بڑی خوشخبری ہے۔ لیکن مجھے حیرت اس بات پر......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''مس تنوینہ۔'' پلیز مجھے اپنے گھر کا ایڈریس بتائیں گی ایکچوئلی میں اپنے پیرنٹس کو بھیجنا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے اب تک صرف آپ جیسی ہی لائف پاٹنر کی تلاش تھی۔'' وہ کہہ رہا تھا اور اس کا غصہ انتہائی درجے تک پہنچ چکا تھا لیکن وہ صرف دانت کچکچا کر رہ گئی۔ اور غصے سے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

اگلے ہی لمحے انٹر کام کی بیل ہوئی تو اس نے اسی انداز میں ریسیور اٹھایا۔

''یس۔'' لہجہ کاٹ دار تھا۔

''ہو گئی تسلی۔'' اس کی مسکراتی آواز کانوں سے ٹکرائی تو کھٹ سے ریسیور رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ کیسی بے بسی تھی۔

''کیا عورت کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں کہ جدھر جاتی ہے کالے بھیڑیئے پہلے سے منہ کھولے کھڑے ہوتے ہیں۔

....

''وینہ بی بی جی یہ کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' وہ اپنے کام میں منہمک تھی جب رحمت نے ایک کارڈ لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

''عمر سلطان۔'' وہ کارڈ پڑھ کر بڑبڑائی۔ اس کا انداز سوچتا ہوا تھا۔

''یہ صرف مجھ سے ملنا چاہتے ہیں یا کسی دفتری کام کے سلسلے میں آئے ہیں؟'' اس کا انداز الجھا ہوا تھا۔

''نہیں جی وہ صرف آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''ہوں ٹھیک ہے تم انھیں وزیٹنگ روم میں بٹھاؤ میں آ رہی ہوں۔'' عمر سلطان کو مجھ سے کیا کام آن پڑا جو یوں اسے ملنے آنا پڑا۔ پہچان تو وہ گئی تھی کہ عمر سلطان کا نام سنتے ہی کہ وہ کون ہے۔ جب وہ وزیٹنگ روم میں داخل ہوئی تو ایک خوبصورت شخصیت اس کے سامنے تھی۔

''جی فرمایئے۔'' وہ رسمی دعا سلام کے بعد بولی۔

''مس تنویہ حیدر یقیناً خالص گھریلو قسم کی باتیں آفس میں اچھی نہیں لگتیں لیکن گھر میں آپ سے ملنے کی میں نے بارہا کوشش کی لیکن شاید آپ بہت زیادہ مصروف رہتی ہیں کسی وقت گھر میں نہیں ملتیں۔'' اس نے شائستہ لہجے میں کہا۔

''جی فرمایئے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟''

''مس تنویہ غلطیاں ہر انسان سے ہوتی ہیں لیکن پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اسے اپنی ان غلطیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔''

''عمر صاحب میرا خیال ہے کہ اتنی لمبی تمہید باندھنے کی بجائے اگر ٹو دی پوائنٹ بات کریں تو زیادہ بہتر ہے۔'' اس کے کہنے پر وہ لب بھینچ کر خاموش ہو گیا۔ اس کا سوچتا ہوا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بات کا سرا تلاش کر رہا ہے۔

''مجھے اندازہ ہے کہ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے لیکن اگر کوئی انسان زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا ہو اور یہ آپ کے اختیار میں ہو کہ چاہے تو آپ اسے موت کے کنویں میں دھکیل دیں یا چاہیں تو اسے نئی زندگی کی نوید دے دیں تو پھر آپ کون سا راستہ منتخب کریں گی؟''

''عمر صاحب میں انسان ہوں خدا نہیں کہ جسے موت اور زندگی پر اختیار ہو۔ ہاں اگر کسی کی میری وجہ سے جان بچ جائے اور وہ موت و زندگی کی کشمکش سے نکل آئے تو مجھے یقیناً بہت خوشی ہوگی۔'' اس نے کہا تو جیسے اس کا حوصلہ بڑھا تھا وہ گہری سانس لے کر دوبارہ گویا ہوا۔

''تنویہ دادو بہت بیمار ہیں وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ اپنی کی گئی زیادتیوں کی معافی مانگنا چاہتی ہیں وہ آپ سے۔ بہت شرمندہ ہیں وہ اپنے کیے پر۔'' اس کے کہنے پر تنویہ کے اعصاب تن گئے۔

''مسٹر عمیر سلطان انھوں نے تو مجھے دیکھا ہی نہیں پھر زیادتی کا کیا سوال؟ ان کے لیے تو میں اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی مر چکی تھی۔ تو پھر آج کیسے انھیں میری یاد آ گئی۔'' وہ تنے تنے چہرے اور ترکش لہجے میں بولی۔

''دادا ابا مرنے سے پہلے انھیں آپ کے متعلق بتا گئے تھے۔'' اس نے نظریں چرا کر بتایا۔

''او آئی سی۔''

''پے در پے ہونے والے حادثات نے انھیں اپنی زیادتیوں کا احساس دلایا ہے۔ میرے ماما پاپا ایک ایئر کریش میں جاں بحق ہو گئے۔ بڑی پھپھو کو پہلے ہی طلاق ہو چکی تھی چھوٹی پھپھو بھی بیوہ ہو کر گھر آ گئیں لیکن پھر جلد ہی بڑی پھپھو نے کسی بوڑھے رئیس سے شادی کر لی اور چھوٹی پھپھو نے بھی ایک بہت بڑے بزنس مین کو پھانس لیا۔ اور دونوں ہی دادو کو بھول گئیں۔ اب صرف میں اور دادو ہیں دادو ہر وقت آپ کو یاد کرتی ہیں۔ میرے سامنے ہاتھ جوڑتی ہیں کہ کہیں سے بھی تنویہ حیدر کو ڈھونڈ لاؤ میں اس کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لوں گی۔''

''ہونہہ خود پر پڑی تو خدا یاد آ گیا۔'' اس نے طنز سے کہا۔

''مسٹر عمر آپ کی دادو دولت کے غرور میں بھول گئی تھیں کہ مکافات عمل بھی ہوتا ہے کہ اپنے کیے کی سزا دنیا میں یہ مل جاتی ہے۔ اور ان سے

کہیے گا کہ معافی مجھ سے نہیں اس عورت سے مانگیں جس کی زندگی انھوں نے عذاب بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔'' اس کا لہجہ زہر خند تھا۔

''مس تنویہ پلیز اگر آپ غیر جانبدار ہو کر سوچیں تو سب سے زیادہ زیادتی تو آپ پر آپ کی اپنی ماں نے کی ہے کہ جسے آپ کو دوسروں کی گود میں ڈال کر خود اپنے لیے خوشیاں تلاش کر لیں۔'' اس نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

''مسٹر عمر۔'' وہ سرد لہجے میں پھنکاری۔

''میری ماں نے میرے ساتھ زیادتی کی یا نہیں، یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی میں کسی کو اس معاملے میں بولنے کی اجازت دیتی ہوں، جائیے اور جا کر اپنی دادی حضور سے کہہ دیجیے کہ میری ماں سے معافی مانگیں جس دن انھوں نے انھیں معاف کر دیا میرے دل سے بھی ساری نفرتیں دھل جائیں گی۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا اور پھر وہاں رکی نہیں۔

اس کے بعد بھی کئی بار منع کرنے کے باوجود وہ اپنے ارادوں سے باز نہ آیا کبھی اس کے روبرو اور کبھی فون کر کے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ایک وہ تھی کہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ اس سے اتنی عاجز آ گئی تھی کہ آخر اسے چوکیدار سے کہنا پڑا کہ اس نام کے شخص کو اندر نہ آنے دے اور فون بھی اس کی بات سنے بغیر ہی بند کر دیتی۔ لیکن ایک دن وہ آندھی و طوفان بنا چلا آیا۔

''صاحب رکو۔'' چوکیدار اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

''بی بی صاب دیکھو میں نے اسے بہت منع کیا لیکن یہ پھر بھی آ گئی ہے۔'' چوکیدار نے خالص پٹھان لہجے میں کہا۔

''تم جاؤ۔'' اور پھر وہ اس کے بولنے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

''میں تمہیں لینے آیا ہوں تنویہ اور لے کر جاؤں گا چاہے اس کے لیے مجھے زبردستی کیوں نہ کرنی پڑے۔'' پھنکارتا ہوا لہجہ اور آنکھوں سے نکلتے شعلے اسے بھسم کر رہے تھے۔

''دادو کی حالت بہت خراب ہے ان کی زبان پر صرف تمہارا نام ہے۔ یقین کرو اگر دادو کو کچھ ہو گیا تو میں تمام عمر تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ کسی رشتے کے تحت نہ سہی انسانیت کے ناطے ان سے مل لو۔'' اس کی باتوں پر وہ سوچنے لگی۔

''سوچنے کا وقت نہیں ہے تنویہ تمہیں ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا ورنہ پچھتاوے تمام عمر تمہارا پیچھا کرتے رہیں گے۔''

''چلیں میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔''

وہ ایکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک لمحے کو اس نے بے یقین نظروں سے دیکھا اور پھر آگے چل دیا۔ اور وہ بنا کسی کو کچھ بتائے اس کے ساتھ چلی آئی۔

''دادو آنکھیں کھولیں دیکھیں کون آیا ہے۔'' وہ ان کے قریب جھکا کہہ رہا تھا۔ اور وہ تھی کہ بستر پر پڑے ہڈیوں کے اس ڈھانچے کو حیرت اور دکھ سے ساکت کھڑی تک رہی تھی۔

دادا ابا نے اسے ان کی تصویریں دکھائیں تھیں جن میں وہ بڑے غرور و تمکنت سے کھڑی تھیں اور اب سامان عبرت بنا ان کا لاغر و کمزور وجود سامنے تھا۔

''دادو پلیز دیکھیں ناں کون آیا ہے۔'' اس کے دوبارہ پکارنے پر ان کے جسم میں ہلکی سی حرکت ہوئی اور ہونٹوں کی بے آواز بے جنبش نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''کک..... کون..... کون میری تانی آئی ہے۔'' اس نے آنکھوں کے اشارے سے اسے قریب آنے کو کہا۔

''جی ہاں دادو آپ کی تانی ہی آئی ہے۔''

''کک..... کہاں ہے..... کہاں ہے؟'' وہ

بے چین ہو اٹھیں اور ہاتھ بڑھا کر ٹٹولنے لگیں جسے اس نے چند قدم بڑھا کر جلدی سے تھام لیا۔ وہ ان کے بالکل قریب آ گئی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

''میری تانی ..... میری تانی۔'' انھوں نے جلدی جلدی اس کا بازو ٹٹولنا شروع کیا اور چندھیاتی ہوئی آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اور وہ تھی کہ باوجود کوشش کے اپنی سسکیاں نہ روک سکی۔ دل پر چھایا نفرتوں کا غبارا یکدم ہی دھل گیا۔ ان کی حالت دیکھ کر تو ایک سنگدل دشمن بھی انھیں معاف کر دیتا اور وہ تو ان کا اپنا خون تھی نرم دل رکھنے والی ان خوبصورت رشتوں کو ترسی ہوئی۔

''میری بچی ..... میری تانی۔ مجھے معاف کر دے۔'' انھوں نے کانپتے لرزتے کمزور ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیئے۔

''نہیں نہیں دادو ایسا نہ کریں۔'' وہ تڑپ اٹھی۔

''میں آپ کی بیٹی ہوں آپ کی تانی ہوں' مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں کوئی شکایت نہیں۔'' وہ روتی چلی گئی۔

''ڈاکٹر ان کی زندگی سے مایوس تھے لیکن اس کا آنا ایک ٹانک کا کام کر گیا۔ ڈاکٹرز بھی حیران تھے کہ یہ کیا معجزہ ہو گیا۔

اس نے آفس فون کر کے تانیہ کو بتا دیا تھا کہ وہ کچھ دن آفس نہیں آ سکے گی' لیکن نہ آنے کی وجہ نہیں بتائی تھی۔ پتا چلنے پر ارسل کو پتا چلا تو اس کا غصہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا کہ وہ تو پہلے ہی دو دن سے اس کے نہ آنے پر ڈسٹرب تھا۔

''کیوں آخر ایسی کیا مجبوری آن پڑی جو وہ یوں بنا بتائے بغیر اجازت چلی گئی۔''

''سران کی کوئی عزیزہ بیمار ہیں۔''

''تو کیا وہ ڈاکٹر ہے جو وہاں بیٹھ کر ان کا علاج کرے گی۔'' وہ بولا۔

''آپ اس سے رابطہ کریں اور فوراً آنے کا کہیں۔ اپنی ہی اجارہ داری سمجھ رکھی ہے ذرا سی ڈھیل دے دو تو سر پر چڑھنے لگتے ہیں۔''

لیکن ان حالات میں نہ تو وہ آ سکتی تھی اور نہ آئی۔ دادو کی حالت دن بہ دن بہتر ہونے لگی تھی۔ وہ جی جان سے ان کی تیمارداری میں جتی تھی۔ اماں سے اس نے اجازت لے لی تھی۔

جس دن وہ ہسپتال سے گھر منتقل ہوئیں تو خوشیوں کی کوئی انتہا نہ تھی وہ بار بار اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوم رہی تھیں۔ غور سے دیکھ رہی تھیں۔

''دیکھو ..... دیکھو عمر اس کی آنکھیں بالکل میرے حیدر جیسی ہیں اور باقی سارا ناک نقشہ اپنی ماں پر گیا ہے۔'' انھوں نے کہا تو وہ اس کی طرف بغور دیکھنے لگا۔

''یہ لڑکی ویسی نہیں جیسی میں اسے سمجھتا تھا حقیقتاً بہت اچھی اور پرخلوص لڑکی ہے۔'' وہ سوچ کر رہ گیا۔ اور اس کے اس طرح دیکھنے پر وہ خجل سی ہو گئی۔

''جاؤ عمر آج میری بچی کو شاپنگ کروا لاؤ۔''

''نہیں دادو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے فوراً انکار کر دیا۔

''کیوں ضرورت نہیں ہے اتنے دنوں سے میرے ساتھ بندھی ہے اور پہلی دفعہ آئی ہو۔''

''لو دیکھو تو ابھی تک بیٹھی ہو جاؤ جا کر تیار ہو۔''

اور پھر اس کے منع کرنے کے باوجود عمر نے اسے ڈھیروں شاپنگ کروائی تھی اور جب وہ دونوں بڑے بڑے شاپنگ بیگ اٹھائے شاپنگ سنٹر سے باہر نکل رہے تھے اندر آتے ارسل پر

اس کی نظر پڑی وہ بھی ٹھٹک کر رک گیا لیکن اس کے پیچھے کھڑے عمر کو دیکھ کر اسے اس کی آنکھوں سے شعلے لپکتے محسوس ہوئے۔ اور پھر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ گہری سانس لیتی عمر کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی۔

.....

''عمر یہ چابی لو میری سیف میں سے نیلی فائل نکال لاؤ۔ آج مجھے ایک قرض اتارنا ہے۔'' کمرے کے ایک کونے میں رکھی سیف میں سے فائل نکال کر اس نے دادو کو دے دی۔

''یہ لو تانی یہ تمہارا حق ہے۔'' انھوں نے وہ فائل اس کو دے دی۔

''یہ کیا دادو جان؟''

''تمہارے باپ کی جائیداد کے کاغذات۔'' انھوں نے کہا تو وہ ناسمجھی کے انداز میں انھیں دیکھنے لگی۔

''جب تک تمہارے دادا زندہ رہے انھوں نے کسی کو انھیں ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ حیدر کا اپنا ایک جما جمایا کاروبار تھا اس کی اپنی فیکٹری تھی یہ گھر بھی اسی نے بنوا لیا تھا۔ جس میں اسے بسنا نصیب نہ ہوا۔'' وہ کرب سے بولیں۔

''اور یہ سب کچھ تیرا ہے اور اس پر اب تمہارا ہی حق ہے۔'' وہ خاموش ہوئیں تو عمر کو بھی کچھ کہنے کا موقع ملا۔

''یوں تو پاپا کا کاروبار بھی بہت اچھا تھا لیکن ان کی وفات کے کچھ عرصہ پہلے ہی ان کا کاروبار آہستہ آہستہ ٹھپ ہو رہا تھا۔ جو بھی ڈیلنگ کرتے اس میں گھاٹا ہی ہوتا۔ اور پھر ان کی وفات کے بعد تو تقریباً سب کچھ ختم ہو گیا۔ کوشش تو میں نے بہت کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اور پھر مجبوراً مجھے حیدر چاچو کی فیکٹری کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ دادا ابا جب تک زندہ رہے انھوں نے اسے بہت خوبصورتی سے سنبھالا اور وہاں سے ہونے والے پرافٹ کو بنک اکاؤنٹ میں جمع کراتے رہے اور وہ آج بھی آپ کے نام جمع ہے۔ دادا ابا سے میں نے سیکھا تو بہت کچھ لیکن پھر بھی فیکٹری کو اس مقام پر نہ لا سکا جو چاچو کے زمانے میں تھا۔ اور پھر دادو کی اچانک بیماری نے سب کچھ دھرم بھرم کر دیا۔'' گہری سانس لیتے ہوئے وہ خاموش ہو گیا۔

''اور دونوں پھپھو وہ کہاں ہیں؟'' وہ جو بڑے انہماک سے سب سن رہی تھی ایکدم بول اٹھی۔

''وہ دونوں اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ ملک سے باہر ہیں۔'' دادو کی بیماری کے متعلق انھیں معلوم ہے اور وہ ہفتے میں ایک آدھ بار فون کر کے اپنا فرض پورا کر دیتی ہیں۔'' اس کے بتانے پر اس نے دادو کی طرف دیکھا تو وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھی تھیں لیکن بند آنکھوں سے نکلنے والے آنسوان کا چہرہ بھگو رہے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر اسے واقعی دکھ ہوا تھا۔

''کسی کی اولاد پر ظلم کرتے وقت میں یہ بھول گئی تھی کہ میری بھی اولاد ہے۔ جس کے ذریعے خدا مجھے غرور کی سزا دے گا۔'' وہ یہ سب سوچ کر رہ گئی۔

''دادو پلیز اتنی ڈس ہارٹ مت ہوں۔'' اس نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

''تانی تم اپنی ماں سے کہنا کہ مجھے معاف کر دے۔ اسے میرے پاس ضرور لے کر آنا۔ نہیں بلکہ جب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو خود جاؤں گی اس کے پاس۔ بس تو میری سفارش کر دینا۔''

''ٹھیک ہے دادو کہہ دوں گی۔'' اب وہ کیسے بتاتی کہ عرصہ ہوا اسے خود اپنی ماں سے ملے ہوئے اور پھر کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

''دادو میرا خیال ہے کہ اب آپ مجھے اجازت دیں بہت دن ہوگئے ہیں مجھے آئے ہوئے اور ویسے بھی آفس سے میں نے بغیر بتائے بہت زیادہ چھٹیاں کر لی ہیں۔''

''لو بھلا اور سنو اب کیا ضرورت ہے تمہیں کسی کی نوکری کرنے کی ماشاء اللہ تم خود فیکٹری کی مالک ہو' عمر تمہارے ساتھ ہے تم دونوں مل کر اس کو چلاؤ۔ اللہ تم دونوں کو ترقی دے۔'' انھوں نے ان دونوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور وہ اتنی نادان تو نہ تھی کہ ان کی بات کا مطلب نہ سمجھتی۔

''نہیں دادو ابھی نہیں' ابھی تو میرا بہت لمبا سفر باقی ہے۔ ابھی مجھے بہت سے قرض اتارنا ہیں۔'' وہ ان کا ہاتھ تھامے نظریں جھکائے دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔

''لو کیسے قرضے اب تیرے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے جس کو جو دینا ہے دے دلا کر فارغ کرو۔ اور اپنا گھر بساؤ۔''

''نہیں دادو پیسے کا قرض نہیں محبتوں کے قرض' ابھی بہت بوجھ ہے ان محبتوں کا مجھ پر۔ آپ پریشان نہ ہوں اب میں آتی جاتی رہوں گی آپ کے پاس۔'' اس نے کہا تو وہ چپ سی کر گئیں۔ اور پھر ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔

''ہاں چلی جاؤ تم بھی میں نے تمہیں دیا ہی کیا ہے جو اپنا حق جتاؤں۔''

''نہیں دادو ایسی بات نہیں ہے.....'' ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ عمر درمیان میں بول اٹھا۔

''میرا خیال ہے تنوینہ ایک دو دن اور ٹھہر جاتیں تو بہتر ہے۔ میرے ساتھ چل کر فیکٹری کو اگر ایک نظر دیکھ لیتیں تو مجھے بھی اطمینان ہو جائے گا۔'' اس کے کہنے پر اس نے دادو کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔ اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے چند دن اور رکنا پڑا۔

اگلے دن فیکٹری سے واپسی پر سگنل پر گاڑی رکی تو عمر کی کسی بات پر ہنستے ہوئے عین برابر کھڑی گاڑی کی اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھے ارسل پر نظر پڑی۔ جو اسے آگ برساتی نظروں سے گھور رہا تھا۔ وینہ نے تیزی سے نگاہیں جھکا لیں اور جیسے ہی سگنل آن ہوا وہ زن سے گاڑی اڑا لے گیا۔ اس کی گاڑی کی سپیڈ اتنی تیز تھی کہ اسے خدشہ ہوا کہ کہیں ایکسیڈنٹ ہی نہ کر بیٹھے۔

اس نے دل میں پکا ارادہ کر لیا تھا کہ کل وہ ضرور آفس جائے گی۔ فیصلہ کر کے سکون سے آنکھیں موند کر بیٹھ گئی۔

.....

''تھینکس گاڈ تنوینہ تمہاری بھی شکل نظر آئی اب ذرا اپنی خیر مناؤ سر کا غصہ ساتویں آسمان کی حدوں کو چھو رہا ہے۔'' اسی وقت انٹر کام پر بیل ہوئی۔

''جاؤ تمہارا بلاوا آیا ہے۔'' تانیہ نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا تو وہ اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے لفظوں کو ذہن میں ترتیب دیتی اٹھ گئی۔

''ذرا دل تھام کر جانا۔'' وہ ایسی سچویشن میں شرارت کرنا نہیں بھولی تھی۔ اور وہ اسے گھورتی نکل گئی۔

''مے آئی کم ان سر؟'' ہلکا سا دروازہ کھول کر وہ بولی۔

''یس۔'' کرخت آواز میں کہا گیا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی وہ بولا۔

''آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں کی مس تنوینہ؟'' اس انتہائی رکھائی سے کہا تو وہ جواب کے لیے لفظ ڈھونڈنے لگی لیکن وہ پھر بول اٹھا۔

''آئی ایم سوری نہ تو اب آپ کے لیے

کوئی سیٹ خالی ہے اور نہ ہی اس کمپنی کو اب آپ کی ضرورت ہے۔''

''آئی ایم سوری سر میری مجبوری تھی کہ آپ کو اطلاع نہ کر سکی۔''

''مجبوری عیاشیوں اور آوارہ گردیوں کو آپ مجبوری کا نام دیتی ہیں۔'' وہ جو اس وقت سے اپنا غصہ کنٹرول کیے بیٹھا تھا ایکدم بے قابو ہوگیا۔

''آئی ایم سوری مس تنوینہ ہماری کمپنی کو باکردار ورکرز کی ضرورت ہے۔ آپ جیسی مردوں کے ساتھ بڑی بڑی گاڑیوں میں گھومنے ہوٹلنگ کرنے اور شاپنگ کرنے والی لڑکیوں کی نہیں۔'' اس کے لہجے میں حقارت اور نفرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس کی زبان سے لفظ نہیں شعلے نکل رہے تھے جنھوں نے اسے سر تا پاؤں جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ کئی لمحوں تک تو حیرت و صدمے سے اس کی آواز میں گنگ ہوگئی وہ حیرت و بے یقینی سے اس کو تکے گئی۔

کچھ دیر بعد ہوش وحواس کی دنیا میں آئی اور سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئی۔ ذلت و توہین کے احساس سے اور غم و غصے سے اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور جسم کا سارا خون چہرے پر جمع ہوگیا۔

''مسٹر ارسل منصور۔'' وہ بولی تو اس کا لہجہ پھنکارتا ہوا تھا۔

''میں نے آج تک آپ کی ہر زیادتی کو برداشت کیا' ہر ذلت کو سہا اپنی ہر تذلیل پر خاموش رہی' لیکن میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی یوں میرے کردار پر کیچڑ اچھالے۔ میں اپنی کردار کشی کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ افسوس صد افسوس مسٹر ارسل مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اتنی گندی اور گھٹیا سوچ کے مالک ہیں میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ کی ذہنیت اتنی پست ہے۔ رہی بات ملازمت کی آپ جیسے انسان کے ساتھ اب میں دو منٹ بھی رہنا گوارا نہیں کر سکتی۔ آپ کا مجھ پر یہی بہت احسان عظیم ہے کہ آپ نے اتنا عرصہ مجھے برداشت کیا لیکن افسوس مجھے اس بات پر ہے کہ میں نے آپ کو سمجھنے میں بہت بڑی غلطی کی ہے..... بہت بڑی۔''

اس نے انتہائی دکھ اور غصے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے مڑی اور تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔ اور اپنے کمرے سے اپنا بیگ اور چادر اٹھائی اور چلی گئی۔

''لگتا ہے صورتحال ایک دفعہ پھر کشیدہ ہو چکی ہے۔'' سرمد نے اظہار خیال کیا۔

''مجھے تو باقاعدہ جنگ کے تاثرات نظر آ رہے ہیں۔'' فرحانہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''یاران حالات میں صلح کا کوئی امکان ہے یا نہیں؟'' فہد پریشان تھا۔

''میرا خیال ہے کہ جب تک ایک دفعہ جنگ ہو نہ ہو جائے اور دونوں فریق اپنا اپنا غصہ ٹھنڈا نہ کر لیں صلح کا امکان نہیں ہے۔'' تنویر بولا۔

''دوستو جنگ تو ہو چکی اب اس جنگ کے نتائج کا انتظار کرو۔'' تانیہ نے اپنے کمرے سے نکل کر اطلاع دی۔

''تمہارا کیا خیال ہے جیت کس کی ہوگی؟''

''میری تو دعا ہے کہ دونوں ہی ہار جائیں کیونکہ اسی شکست میں جیت ہے۔'' تانیہ نے اطمینان سے کہا۔

.....

وہ جب سے لوٹی تھی منہ سر لپیٹے پڑی تھی نہ تو اس نے کسی سے بات کی اور نہ ہی دوپہر کا کھانا

کھایا تھا۔ نجانے کیوں اس کے دل سے ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔ دور کی لہریں تھیں کہ بے قابو ہوئے جا رہی تھیں اسے ارسل سے ایسی توقع ہرگز بھی نہیں تھی کہ وہ اس طرح اسکے کردار کے چیتھڑے اڑائے گا۔ اس کی ذات کا یقین، اعتماد اس طرح مجروح کرے گا کہ وہ خود بھی ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔

وہ انجانے میں ہی نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنے دل میں بہت اونچا مقام دے چکی تھی۔ اور اس غلطی کا اب اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ وہ اتنے اونچے مقام کے قابل ہرگز بھی نہیں تھا۔ وہ خود پرست انسان کسی کے نرم و نازک جذبات کو کیا جانے جسے غرور تھا تو صرف اپنی شخصیت پر جسے ناز تھا تو صرف اپنی ذات پر۔

''ارسل منصور تم واقعی اس قابل نہ تھے کہ تمہیں چاہا جاتا۔'' اس نے اپنی سسکی دبائی۔

''میں نے سب کچھ جانتے بوجھتے آگ سے دوستی کی ہے۔ لیکن کاش کہ میں خود کو روک سکتی......کاش۔''

وہ کئی دنوں سے نوٹ کر رہی تھیں کہ وہ ایک دفعہ پھر الجھ گیا ہے نہ تو کسی کام میں دلچسپی نہ ہی کھانے پینے کا دھیان۔ کھانے کی ٹیبل پر صرف دو لقمے لیتا اور اٹھ جاتا۔

آج بھی وہ الجھا الجھا اور پریشان حال گھر میں داخل ہوا تو انھوں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے پکار لیا۔

''ارسل بیٹا۔'' وہ ٹھٹک کر رکا۔

''جی آنٹی۔'' اس کے آنٹی کہنے پر ان کا دل کٹ کر رہ گیا۔

وہ جب اس گھر میں آئیں تھیں تو وہ صرف آٹھ برس کا تھا۔ اور پہلے روز بھی اس نے انھیں آنٹی ہی کہا تھا۔ انھوں نے اپنی ساری پیاسی ممتا اس پر لٹا دی۔ پیار کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اس کے سپرد کر دیا۔ لیکن وہ آج بھی ان سے اتنے ہی فاصلے پر کھڑا تھا جتنا کہ پہلے روز تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ انھیں پریشان کرتا تھا یا ان کی عزت نہیں کرتا تھا مگر پھر بھی وہ بات نہ تھی جو کہ ہونا چاہیے تھا۔ شاید وہ ذہنی طور پر انھیں ماں کا مقام نہ دے سکا تھا۔

لیکن ان کی محبت میں کمی کسی طرح نہیں آئی کہ وہ فطری طور پر ایک اچھا اور سلجھا ہوا بچہ تھا۔ اپنی اچھی عادات کے باعث وہ انھیں بے حد عزیز تھا۔ لیکن چونکہ وہ ان کے ساتھ بہت کم بات کرتا تھا اس لیے وہ بھی محتاط ہو کر بات کرتیں۔ اور پھر جب سے منصور صاحب اس دنیا سے رخصت ہوئے اس نے ان سے بات کرنا بالکل ہی ختم کر دی تھی۔ نجانے کیوں وہ اس کی وجہ نہ جان پائیں۔

''یہاں آؤ بیٹا میرے پاس۔'' انھوں نے اپنے تاثرات چھپاتے ہوئے وہیں کھڑے کھڑے اسے پکارا تو وہ ان کے قریب سے ہوتا ہوا صوفے پر ڈھے سا گیا۔

''کیا بات ہے بیٹا میں کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ تم بہت پریشان ہو؟'' انھوں نے کہا تو وہ اپنے الجھے بالوں میں ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

''ماں کی حیثیت سے نہ سہی گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے ہی سہی اگر تم مجھ سے بات کر لیا کرو تو ہو سکتا ہے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔'' انھوں بڑے رسان سے کہا تو وہ بغور ان کے چہرے کے نقوش کو جانچنے لگا۔

''آنٹی آپ نے پاپا سے شادی کیوں کی؟'' اس نے اچانک ہی الٹا سا سوال کیا تو وہ ناسمجھی سے دیکھنے لگیں۔

''آخر آپ نے پاپا سے ہی شادی کیوں

کی؟'' اس کا سوال بدستور تھا۔
''بیٹا ہمارے معاشرے میں شریف اور عزت دار لڑکیاں شادی کرتی نہیں ہیں بلکہ ان کی شادی کی جاتی ہے۔''
''یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ آخر پاپا نے آپ سے ہی شادی کیوں کی؟'' اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی کے ساتھ ساتھ شک کا عنصر بھی نمایاں تھا۔
''بیٹا کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی' کوئی خامی یا کوتائی ہوئی ہے' اگر میں نے غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہے تو مجھے بتاؤ تاکہ میں اس کا ازالہ کر سکوں۔'' وہ بہت دھیرج سے اور سنبھلتے ہوئے انداز میں بولیں۔
''جی نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔'' وہ لب کاٹ کر رہ گیا۔
''تو پھر؟'' وہ سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگیں۔
''تو پھر یہ کہ پاپا آپ کی بجائے کسی بھی بیوہ یا طلاق یافتہ سے شادی کر سکتے تھے۔ اور آپ جیسی پڑھی لکھی اور خوبصورت لڑکی کو تو کسی بھی اچھے سے اچھے گھرانے کا رشتہ مل سکتا تھا۔'' وہ ابھی تک الجھا ہوا تھا اس کے بتانے پر وہ بات کی تہہ تک پہنچی تو اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو نہ روک سکیں۔
''میں بھی تو بیوہ ہی تھی بیٹا۔'' انھوں نے کہا تو اس نے چونک کر حیرت و بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا تو انھوں نے سر ہلا کر دوبارہ یقین دہانی کروائی۔ لیکن اسے بہت اچھی طرح یاد تھا کہ وہ جب یہاں آئیں تھیں تو بالکل ایک نوخیز اور نوعمر لڑکی سی تھیں اور ان کی تصویریں آج بھی اس بات کی گواہ تھیں بلکہ یہی نہیں صرف اسے یہ بھی یاد تھا کہ جب وہ یہاں آئیں تو کافی عرصہ تک یونیورسٹی میں پڑھتی رہی تھیں۔
''ہاں بیٹا نہ صرف بیوہ بلکہ ایک بچی کی ماں بھی۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولیں تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ حیرتوں کے پہاڑ گرا رہی ہوں۔
''پھر آپ اسے ساتھ کیوں نہیں لائیں۔''
''میں تو لانا چاہتی تھی لیکن آپ کے پاپا نہیں مانے۔''
''کیوں؟'' وہ جلد از جلد سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔
''اس لیے کہ وہ تمہارے ساتھ کسی کی شراکت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ میری خالی گود اس بات کا ثبوت ہے۔ تمہارے پاپا کا خیال تھا کہ اگر میرے اپنے بچے اس گھر میں آ گئے تو میں تم پر توجہ نہ دوں گی۔'' انھوں نے گہری سانس لیتے ہوئے بتایا تو شرمندگی سے اس کا سر جھک گیا۔
''آ..... آنٹی ایم سوری آنٹی۔ میں نے ہمیشہ آپ کو غلط سمجھا میں ہمیشہ یہی سمجھتا رہا کہ آپ نے صرف پاپا کی دولت کی وجہ سے ان سے شادی کی ہے اور ایک دن دولت کے ساتھ ساتھ آپ انھیں بھی مجھ سے چھین کر لے جائیں گی۔ لیکن یقین کریں آنٹی اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میرا ایک دوست تھا اس کے پاپا نے ایک بہت خوبصورت لڑکی سے شادی کر لی حالانکہ اس کی ماں بھی زندہ تھی۔ پھر وہ میرے دوست کے پاپا کے ساتھ ساتھ ساری دولت و جائیداد بھی سمیٹ کر لے گئی۔ جب پاپا نے آپ سے شادی کی تو اور آپ یہاں آئیں تو میں آپ کو دیکھ کر یہی سوچا کرتا تھا کہ یہ بھی بہت خوبصورت ہے یہ بھی میرے پاپا کو مجھ سے چھین کر لے جائے گی۔ یہی وہ خوف تھا جس نے مجھے آپ کے

قریب نہ آنے دیا۔'' وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگیا تو انھوں نے اس کے جھکے سر کے بال سنوارے۔

''بیٹا سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔''

اور پھر وہ دھیرے دھیرے اپنی زندگی کا المیہ اسے بتانے لگیں۔ اپنی زندگی پر بیتے حادثات اسے بتانے لگیں۔ بہت عرصہ ہوگیا تمام بوجھ اپنے دل پر اٹھائے ہوئے اور اب انھیں بھی کسی ہمدرد کسی غمگسار کی ضرورت تھی۔

''اور پھر بیٹا جب خدا نے میری بہن کو اولاد سے نوازا تو میں نے بہت چاہا کہ میں اپنی بیٹی وینی کو اپنے پاس لے آؤں لیکن تمہارے پاپا نہیں مانے تو پھر مجبوراً میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا۔ صرف اس کی خاطر اس کی خوشیوں کی خاطر لیکن وہ مجھ سے بہت بدظن ہے شاید وہ سمجھتی ہے کہ میں نے اپنی خوشیوں کی خاطر اسے دوسروں کی جھولی میں ڈال کر بھول گئی ہوں۔ آپا نے کہا تھا کہ تمہاری شادی ہوگئی تو تمہیں اور بچے مل جائیں گے۔ لیکن میری گود تو آج بھی خوشیوں سے خالی ہے۔'' ان کی آنکھیں پانیوں سے لبالب بھری تھیں۔

''میں نے تو یہی سوچا کہ اگر میں نے اس سے پیار کیا اسے توجہ دی تو وہ کہیں بٹ نہ جائے کہیں بکھر نہ جائے۔ کانچ سے بھی زیادہ نازک تھی وہ تو۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری طرح اس کے حصے میں بھی ناریائیوں کا دکھ آئے۔'' وہ بہت خوش اور مطمئن تھی اپنی زندگی میں کیونکہ اسے ماں اور باپ دونوں کا پیار مل رہا تھا اور پھر بہن بھائی کا ساتھ بھی تھا۔ لیکن زندگی بہت ظالم ہے بہت رنگ بدلتی ہے۔ بھائی صاحب بہت جلد اس دنیا سے چلے گئے ان کے بعد آپا نے چاہا کہ وہ میرے پاس چلی آئے لیکن وہ نہیں مانی۔ اور اب میں سوچتی ہوں کہ اچھا ہی ہوا جو وہ یہاں نہیں آئی۔ ورنہ شاید ہمیشہ میری طرح بزدل ہی رہتی۔ اب حالات نے اس کانچ سے بھی زیادہ نازک لڑکی کو اتنا مضبوط بنا دیا ہے کہ وہ اب ہر مشکل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ اب معاشرے میں اس کا ایک نام ہے ایک حیثیت ہے۔ اسے دیکھ کر دل میں کسک تو اٹھتی ہے لیکن پھر سوچتی ہوں کہ شاید یہ سب کچھ اس کی بہتری کے لیے تھا۔''

وہ آج اپنے دل کا ایک ایک درد اسے سنا رہی تھیں باتوں میں وہ دونوں اتنے مگن تھے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔ آج برسوں بعد اپنے دل کا بوجھ ہلکا ہونے پر بغیر نیند کی گولیاں کھائے وہ بڑے سکون سے سوئیں تھیں۔

اور ایک وہ تھا کہ جس کی نیند کافی دنوں پہلے اس سے روٹھ گئی تھی۔ اور آج بھی رات آدھی سے زیادہ گزر جانے کے باوجود سکون کا ایک لمحہ بھی اس کے پاس نہ آیا تھا۔ اس کے اندر کئی برسوں کی لگی آگ پھر بھڑک اٹھی تھی۔ سوچوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو اسے آرام دہ بستر پر بھی سکون نہیں لینے دیتا تھا۔ سوچتے سوچتے دماغ تھک گیا تو وہ پھر خود سے الجھ پڑا۔

''تنوینہ حیدر آخر کیوں چلی آئیں تم میری زندگی میں؟'' اس نے الجھ کر اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے بال نوچ لیے۔ وہ یہ جملہ آج ہی نہیں بلکہ پچھلے کئی برسوں سے ہر رات اور دن میں نجانے کتنی مرتبہ دہراتا

''کاش کہ پاپا نے تمہیں میرے آفس میں جاب نہ دی ہوتی۔ کاش کہ پہلی نظر میں ہی میرے دل نے تمہاری تمنا نہ کی ہوتی۔ کاش کہ میں تمہیں نظرانداز کر سکتا۔'' اور اس طرح کے بہت سے کاش اس کی زندگی میں شامل ہوگئے تھے۔ بہت عرصے سے اس کے اندر ایک جنگ

جاری تھی جو وہ خود سے بھی لڑتا آ رہا تھا۔

.....

وہ جسے اپنے حسن و وجاہت، دولت اور شہرت پر ناز ایک غرور تھا۔ جس نے کبھی اپنی ہم پلہ لڑکی کو لفٹ نہ کرائی تھی تو وہ تنویہ حیدر جیسی لڑکی کے سامنے کس طرح اپنی ہار تسلیم کر لیتا۔ وہ جو سوچتا تھا کہ غریب لوگ اس دنیا میں پیدا ہی کیوں ہوئے جو انسان صرف دو وقت کی روٹی کے لیے ترسے اسے جینے کا کیا حق ہے۔ تو ایسے میں تنویہ حیدر جیسی حالات کی ماری ہوئی مجبور و بے بس لڑکی اس کی زندگی کی امنگ بن کر چلی آئی تھی۔ جس کی شخصیت میں غربت کے باوجود ایک وقار تھا ایک تمکنت و خود اعتمادی تھی۔ اس کا ہر اسٹائل نشست و برخاست کا انداز، رکھ رکھاؤ کا سلیقہ چیخ چیخ کر گواہی دیتا کہ دیکھو مجھے، میں کوئی عام سی نہیں بلکہ بہت غیر معمولی لڑکی ہوں۔

اور پھر پاپا کا اس کا اس طرح سے خیال رکھنا اسے مزید چڑا جاتا کہ آخر پاپا اس غریب سی لڑکی کو کیوں اتنی اہمیت دیتے ہیں۔ اور پھر لاکھ اس کے وجود سے انکار کے باوجود بنا دستک دیئے وہ لڑکی بغیر اجازت لیے اس کے دل کی دنیا بسانے چلی آئی تھی۔ وہ اپنے شوریدہ جذبات کے آگے بند باندھتے باندھتے ناکام ہو جاتا تو اسی سے الجھ پڑتا۔ بلاوجہ اسے ڈانٹتا اسے ذلیل کرتا اس کی تحقیر کرتا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے چلی جائے لیکن شاید وہ اتنی مجبوری تھی کہ اتنی ذلت سہنے کے باوجود بھی کہیں نہ جاتی۔ اگرچہ وہ چاہتا تو تھا کہ وہ چلی جائے لیکن جب وہ ایک دو دن چھٹی کر لیتی تو اسے اپنے دل کی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہوتی۔ وہ ہر جگہ ہر چہرے میں اسے کھوجتا اور جب وہ آتی تو خوب اس کے ساتھ الجھتا۔ اسے ایسے ایسے القابات سے نوازتا کہ اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ برداشت نہ کرتا۔ وہ بڑے ضبط سے اس کا ہر ظلم زیادتی ہر طنز و طعنہ برداشت کرتی لیکن وہ ایسا کر کے نجانے اپنے کن جذبات کی تسکین چاہتا تھا۔ حالانکہ ایسا کرنے پر اس کے اندر کی آگ مزید بھڑک اٹھتی اور ایسے میں اس کا جی چاہتا کہ اس کا گلہ دبا دے جس نے اسے اس دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔

وہ کسی بھی طرح اس حقیقت کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ وہ ایک معمولی لڑکی کے آگے ہار گیا ہے۔ اس نے تو ہمیشہ میدان مارا تھا ہر جگہ بازی جیتا تھا۔ ہر دفعہ ونر بنا تھا تو اب زندگی کی اتنی بڑی ہار پر کس طرح خاموش بیٹھا رہتا۔ اس نے اپنی طرف سے سر توڑ کوشش کی تھی کہ اپنے دل کو ہرا دے اور خود ونر بن جائے لیکن یہاں وہ ناکام رہا تھا۔ ہاں البتہ پاپا کی وفات کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اب وہ تنویہ سے نفرت کرنے لگا ہے۔ کتنی خود غرض بن گئی تھی ان دنوں وہ۔ بیٹیوں کی طرح چاہا تھا پاپا نے اسے۔ لیکن اس نے ان کے مرنے پر ہمدردی کے دو بول بھی نہ کہے تھے۔ کتنا انتظار کیا تھا اس کا۔ ہر آہٹ پر چونکا تھا ہر قدم پر تلاشا تھا لیکن وہ نہیں آئی۔

اگر وہ آ جاتی تو شاید وہ اس کے سامنے کھل جاتا بکھر جاتا۔ اپنی زندگی کے ماہ و سال کا ایک ایک لمحہ اس کے سپرد کر دیتا۔ اسے بتاتا کہ میں نے زندگی کا سفر بالکل تنہا کیسے طے کیا ہے۔

ماما کے بعد وہ ایک دم اکیلا ہو گیا۔ پاپا آفس چلے جاتے تو سکول سے واپسی پر کوئی مجھے بانہوں میں بھر کر پیار نہ کرتا۔ کوئی محبت سے نوالے توڑ کر میرے منہ میں ڈالتا۔ بس میری گورنس میرے سامنے کھانا رکھ کر خود رسالہ پڑھنے بیٹھ جاتی اور میں آنکھوں میں آنسو لیے ایک دو نوالے لے کر اٹھ جاتا۔ راتوں کو اپنے بیڈ

پر لیٹا تکیے میں منہ چھپا کر ماما کو یاد کر کر کے روتا رہتا۔ لیکن کوئی میرے آنسو نہ پوچھتا۔ پاپا بہت مصروف رہتے ورنہ میں انھیں زیادہ تنگ نہ کرتا۔

اور پھر آنٹی اس گھر میں آ گئیں لیکن میں نے تو اپنے دل میں خود ہی غلط فہمی کا بیج بو لیا تھا۔ وہ میرے سکول سے واپسی پر مجھے لپٹا کر پیار بھی کرتیں، محبت سے کھانا بھی کھلاتیں، رات کو میرے کمرے میں مجھے سلانے بھی آتیں۔ لیکن وہ جو ایک ڈر ایک خوف میرے اندر بیٹھ گیا تھا اس نے مجھے ان سے قریب ہونے سے روک دیتا۔ اور ہوا یوں کہ وہ اولاد کے پیار کے لیے تڑپتی رہی اور میں ماں کی گود کے لیے ترستا رہا۔

پھر جب پاپا اس دنیا سے رخصت ہوئے تو مجھے ایسا لگا جیسے میری دنیا اندھیر ہو گئی ہو۔ مجھے صحیح معنوں میں اب پتہ چلا کہ تنہائی کیا ہوتی ہے۔ کوئی ایسا ہمدرد و غمگسار دکھائی نہ دیتا کہ جس کے کندھے پر سر کو رکھ سکوں۔ ہر چہرہ مجھے مکر و فریب سے اٹا ہوا لگتا۔ اور اسے میں اگر منتظر تھا تو صرف تنویہ حیدر تمہارا۔

لیکن تم نہیں آئی۔ نجانے اس میں تمہاری کیا مصلحت تھی حالانکہ میں نے آفس کے لوگوں سے سنا تھا کہ میری طرح تم بھی غم سے نڈھال تھیں۔ میں تم سے مل کر پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا، لیکن وہی جھوٹی انا آڑے آئی۔ اور پھر تمہارے انتظار کی جھنجلاہٹ کو اپنے اندر کے غصے کو میں نے نفرت سمجھ لیا۔ بہت عرصہ لگا مجھے خود کو یہ باور کرانے میں کہ مجھے تم سے نفرت ہو گئی ہے۔ اور پھر خود کو بہت مضبوط کر کے میں تمہارے سامنے آیا۔ لیکن یہ سب میری خام خیالی تھی۔ تمہیں دیکھتے ہی میرے تمام ارادے بکھر گئے۔ اور میں کوشش کے باوجود بھی میں تم سے نفرت نہ کر سکا۔ لیکن پھر بھی میں تمہاری طرف سے ہی پیش قدمی کا منتظر رہا۔ لیکن کیوں میں نے تمہارا انتظار کیوں کیا؟ میں نے تمہیں دیا ہی کیا تھا جو تم میری محبت کو کچھ سمجھ سکتیں۔ میں نے تو تم سے محبت کرتے ہوئے بھی تمہیں ہمیشہ نفرت کا احساس دلایا۔

''ہاں۔'' ارسل منصود آخر وہ بھی تو انسان ہے۔ تم نے ہر موڑ پر اس کی تحقیر کی۔ تم نے اس سے محبت کرتے ہوئے بھی بدلے میں محبت مانگنے کو اپنی توہین سمجھا۔ وہ تو پھر ایک عورت ہے جو محبت کے معاملے میں ہمیشہ اپنی انا کو اونچا رکھتی ہے۔ لیکن نرمی سے اسے جس سانچے میں ڈھالو ڈھل جاتی ہے۔ لیکن تم نے آخر تم نے اسے کیا دیا۔ ذلت، تحقیر، رسوائی اور پھر آخر میں تم نے چھوڑا ہی کیا؟ اس کے کردار تک کے بخیئے ادھیر دیئے۔

''کیا اب وہ تمہیں معاف کرے گی؟''

''نہیں اب تو اگر تم اس سے محبت کی بھیک بھی مانگو گے تو وہ تمہیں نہ دے گی۔

''ہار گیا ہوں میں، تھک گیا ہوں تنویہ حیدر میں آج واقعی یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے، کیونکہ اگر میں نے آج بھی اسے تسلیم نہ کیا تو ذہنی مریض بن جاؤں گا، پاگل ہو جاؤں گا تمہارے بنا۔'' وہ اپنے سر بیڈ پر پٹخنے لگا۔

''لیکن اب میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں، کس سے پوچھوں؟ میں نے تو اپنے ہاتھوں سے تمہیں خود ہی گنوا دیا ہے اپنی انا سے مجبور ہو کر کھو بیٹھا ہوں تمہیں۔ اور اگر میں تمہیں ڈھونڈ بھی لوں تو کیا تم مجھے محبت کے بدلے محبت دے سکو گی؟ شاید..... شاید نہیں اور ہو سکتا ہے کہ تم نے اب تک اپنی زندگی کا ساتھی چن بھی لیا ہو۔ اور ہاں تنویہ حیدر میں تمہیں بتاؤں کہ میں نے تو شاید اس دن اپنی ہار تسلیم کر لی تھی جس دن پارٹی میں

سب لوگ غلط فہمی کا شکار ہوئے اور پھر تم نے اپنے جس خوبصورت سے انداز میں شکریہ ادا کیا تھا پھر میں نے تمہیں تمہاری تمام خامیوں (جو کہ خامیاں نہیں) سمیت قبول کر لیا۔ لیکن پھر بالکل اچانک ہی وہ اجنبی شخص چلا آیا۔ نجانے کون تھا وہ جس کے ساتھ تم مجھے اتنی خوش اور مطمئن دکھائی دیں اور پھر میں یہ کیسے برداشت کرتا کہ تم میری زندگی میں آگ لگانے کے بعد کسی اور کی رفیق بن جاؤ اور اس حسد نے مجھے جلا کر بھسم کر ڈالا۔ اور شاید اب میں ساری زندگی اس آگ میں جلتا رہوں گا۔''

''ہاں ارسل منصور تم ..... تم ہمیشہ کے لیے اسے کھو چکے ہو وہ تم سے بہت دور جا چکی ہے تم نے بہت دیر کر دی ہے ارسل بہت دیر۔'' اس نے سوچا تو اس کا دل درد کی شدت سے بلبلا اٹھا۔

''نہیں ..... نہیں تنویہ حیدر میں تمہارے بغیر جی نہ پاؤں گا۔'' وہ دھیرے دھیرے نفی میں سر ہلانے لگا۔

''کیا بات ہے ارسل بیٹا آپ اس وقت جاگ رہے ہیں خیریت۔'' آنٹی کی آواز اس نے چونک کر سر اٹھایا تو وہ دھک سے رہ گئیں۔ اتنی سردی میں میں اس کا چہرہ پسینے سے لبریز تھا۔ آنکھیں سرخ انگارا ہو رہی تھیں۔

''کیا ہوا بیٹا طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟ کیا ساری رات نہیں سوئے؟'' وہ اس کے قریب چلی آئیں اور دوپٹے کے پلو سے نرمی کے ساتھ اس کا چہرہ صاف کرنے لگیں۔

''ماما۔''

''جی میری جان۔'' اس کے ماما پکارنے پر وہ تڑپ اٹھیں۔

''ماما پلیز مجھے معاف کر دیں مجھے اپنے دامن میں پناہ دے دیں' ماما میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔ ماما پلیز مجھے اپنی آغوش میں چھپا لیں۔'' اس کی فریاد پر انھوں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

''میرے بیٹے تم اکیلے نہیں ہو میں ہوں ناں تمہارے پاس۔ مجھے بتاؤ کیا پریشانی ہے تمہیں میں تمہارے سارے غم سمیٹ لوں گی میرے بچے۔'' آج ان کی بھی تو پیاسی روح سیراب ہو گئی تھی۔ اور پھر اس نے واقعی سب کچھ کہہ سنایا۔ اپنے دل کا ایک ایک زخم کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا۔

''ماما میں نے ہمیشہ اس کے ساتھ زیادتی کی' ہمیشہ اس پر ظلم کیا' اور نتیجے میں اب وہ مجھے چھوڑ گئی ہے کھو دیا ہے میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے۔'' اس نے اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ انھیں بتا رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھیں کہ خدا کتنا مہربان ہے جو اپنے بندوں کو ان کے صبروں کا پھل اس طرح بھی دیتا ہے۔ وہ تو کبھی اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتیں تھیں کہ وہ اپنی ہی بیٹھی کو اپنے گھر بہو بنا کر لائیں گی۔ خدا نے انھیں کس طرح نوازا تھا کہ وہ اس کا جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا۔

''تم فکر نہیں کرو بیٹا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ہوں نہ تمہارے ساتھ۔'' انھوں نے اس کے بال سنوارتے ہوئے ایک یقین کے ساتھ تسلی دی۔

''میرا خیال ہے فجر کی اذانیں ہو رہی ہیں اٹھو وضو کرو اور نماز پڑھ کر خدا سے دعا مانگو اور پھر آرام سے سو جاؤ انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

نماز اور قرآن پاک کی تلاوت سے فارغ

ہو کر وہ اپنے لیے چائے بنانے کچن میں چلی آئیں۔ اب ان کا سونے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ لہذا انھوں نے اسٹڈی روم کا رخ کیا۔ ویسے بھی انھیں کافی عرصہ ہی ہوگیا تھا ادھر کا چکر لگائے۔ تمام کتابیں اور چیزیں بے ترتیب پڑی تھیں۔ ملازمہ ہی کبھی کبھی ادھر کی صفائی کر جاتی تھی۔

انھوں نے چائے کا مگ ٹیبل پر رکھا اور کتابوں کو ترتیب دینے لگیں۔ گرد جھاڑنے کے لیے بڑی بڑی کتابوں کو بہت احتیاط سے اٹھا اٹھا کر نیچے رکھا تو ان کے پیچھے سے نیلی جلد والی ڈائری ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ انھیں معلوم تو تھا کہ منصور صاحب کبھی کبھی ڈائری لکھتے ہیں لیکن انھیں کبھی دیکھنے یا پڑھنے کا تجسس نہ ہوا تھا۔ لیکن آج تو خود بخود ان کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ وہ اسے لیے چیئر پر آن بیٹھیں اور پہلا صفحہ کھولا۔

''رئیسہ حسن وصورت میں یکتا تھی۔ اچھی بیویوں کے تمام اوصاف اس میں تھے وہ ایک آئیڈیل بیوی تھی۔ میں نے اسے اپنے دل کی تمام تر شدتوں کے ساتھ چاہا۔ اس کے ساتھ گزرے ازدواجی زندگی کے دس سال مجھے خواب سے لگتے ہیں۔ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئی مجھے ایسا لگا جیسے میری دنیا ہی ختم ہوگی ہو۔ میں نے اس کے بعد شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن عورت کے بغیر گھر ایک سرائے لگتا۔ رئیسہ کے جانے کے بعد جہاں گھر کا نظام دھرم بھرم ہوا وہاں ہمارا بیٹا ارسل جو کہ شادی کے دو سال بعد بڑی منتوں مرادوں کے بعد ہمیں ملا تھا وہ بھی ڈسٹرب ہوگیا۔ رئیسہ کی یاد کو بھلانے کے لیے میں نے خود کو بزنس میں مصوف کر لیا۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ ارسل میری محبتوں سے بھی محروم ہوگیا اور اس کی محرومی کو دیکھتے ہوئے مجھے مجبوراً دوسری شادی کا فیصلہ کرنا پڑا۔

اور پھر انکل شجاعت ملک جنھوں نے باتوں ہی باتوں میں زرمینہ کا پہلے کئی بار ذکر کیا تھا ان سے اس سلسلے میں بات کی تو انھوں نے واضح طور پر زرمینہ کا نام لیا۔ حیدر سے میری دوستی بہت گہری تو نہ تھی لیکن وہ ایک اچھا دوست تھا۔ اپنی ازدواجی زندگی سے وہ بہت مطمئن اور مسرور تھا اپنی بیوی کی خوب سیرتی کی اکثر تعریف کرتا۔ ایک دو بار زرمینہ کو بھی میں نے اس کے ساتھ دیکھا تھا سو میں نے ہامی بھر لیے لیکن کوشش کے باوجود بھی میں اپنے دل میں زرمینہ کو وہ مقام نہ دے سکا جو کہ رئیسہ کا تھا اور شاید ادھر زرمینہ کی بھی یہی حالت تھی کہ وہ حیدر کو ابھی تک فراموش نہ کر سکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم قربت کے باوجود بہت فاصلوں پر کھڑے تھے۔''

انھوں نے اتنا پڑھ کر گہری سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے سر ٹیک دیا۔

''منصور آپ نے کبھی مجھے سمجھا ہی نہیں جس نے پچیس سال کا طویل عرصہ آپ کے ساتھ گزارا ہے اگر آپ ان پچیس سالوں میں ایک ذرا سی توجہ بھی مجھے دیتے تو حیدر کے ساتھ گزرے دو سال مجھے کبھی اتنی تکلیف نہ دیتے۔''

وہ سیدھی ہو بیٹھیں اور صفحہ پلٹ کر پھر پڑھنے لگیں:

''شاید مرد اپنی محبت کے معاملے میں بہت خودغرض اور کم ظرف ہے۔ یہی وجہ ہوئی کہ جب زرمینہ نے مجھ سے اپنی بیٹی کو یہاں لانے کی بات کی تو مجھے یہ گوارا نہ ہوسکا کہ حیدر کی کوئی نشانی اس گھر میں آ کر میرے بیٹے کی حق تلفی کرے۔ حالانکہ میرا اپنا یہ حال تھا کہ میں رئیسہ کی نشانی میں کوئی شراکت برداشت نہ کر سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ

میں نے بھرپور کوشش کی کہ زرمینہ دوبارہ کسی بچے کی ماں نہ بن سکے۔ اور میں اس کوشش میں کامیاب بھی رہا۔ لیکن میں جب جب بھی زرمینہ کو ترستی ہوئی صورت دیکھتا خود کو شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا ہوا محسوس کرتا۔

اور اس وقت تو پچھتاوے مجھے ڈسنے لگے جب تنویہ جاب کے لیے مجھ تک پہنچی وہ بچی اتنی خوبصورت اور معصوم تھی کہ جسے دیکھتے ہی بے اختیار میرا پیار سے بیٹی کہنے کو جی چاہا کیونکہ میں بھی تو بیٹی کے پیار کے لیے ترسا ہوا تھا۔ اور پھر اس کی ذہانت سے چمکتی آنکھوں اور لہجے سے چھلکتے اعتماد سے متاثر ہو کر فوراً ہی فیصلہ کر لیا اور پھر باقاعدہ پلاننگ کے تحت اسے ارسل کی اسسٹنٹ مقرر کر دیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر چھپے جوہر نمودار ہونے لگے۔ وہ واقعی ایک قابل اور ذہین لڑکی تھی اس نے بہت جلد خود کو امپروو کر لیا تھا۔ لیکن ارسل ہمیشہ اس سے خائف ہی رہتا وہ تو پہلے دن سے ہی اسے اتنی بڑی سیٹ دینے کے خلاف تھا لیکن وہ میری توقعات سے کہیں زیادہ باصلاحیت تھی اور اب تو اسے دیکھ کر میرے دل میں نئی نئی خواہشیں پیدا ہونے لگیں تھیں۔ میں جو کہ پہلے اسے اپنی بیوی کے پہلے شوہر کی اولاد کی حیثیت سے اپنے گھر میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا اب اسے اپنی بہو بنانے کے خواب دیکھنے لگا۔ اس لیے میں نے اسے اور ارسل کو زیادہ سے زیادہ قریب آنے کا موقع دیا لیکن ارسل تھا کہ دن بہ دن اس سے بدظن ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی صرف ایک ہی رٹ تھی کہ اسے یہاں سے ہٹا دیں جبکہ میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔"

اور پھر کچھ آگے تقریباً آخری صفحات پر انھوں نے لکھا تھا:

"آخرکار آج میں نے ارسل کے اندر چھپے خوف کو بھانپ لیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں اپنی اس دریافت پر۔ ہاں میں جان گیا ہوں کہ وہ اپنے اندر سے خوفزدہ ہے۔ محبت کے معاملے میں انتہائی بزدل، لیکن خود کو بہت مضبوط ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ لیکن شاید اب وہ اپنے اندر ابلتے محبت لاوے کے سامنے بے بس ہو چکا ہے۔ جب میں نے اس سے تنویہ کو اپنے ساتھ ملک سے باہر لے جانے کی بات کی تو اس لمحے اس کی حالت ایسی ہوگی جیسے میں اس کی متاع حیات چھین کر لے جا رہا ہوں حالانکہ ابھی یہ بات کنفرم نہیں ہے کہ تنویہ اس کے لیے مامتی بھی ہے یا نہیں۔ لیکن پھر بھی وہ بوکھلایا بوکھلایا سا پھرتا ہے جیسے مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ اور اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کی زندگی کی خوشیاں اسے سونپ دوں گا اور اس سلسلے میں بہت جلد زرمینہ سے بات کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ کبھی انکار نہیں کرے گی۔"

زرمینہ نے ڈائری کو بڑے سرسری انداز میں پڑھا تھا لیکن آخری دو تین صفحات تفصیل سے پڑھ کر مطمئن سے انداز میں کرسی کی پشت سے سر ٹیک دیا اور دل ہی دل میں نجانے کون کون سے فیصلے کرنے لگیں۔

سامنے لگے وال کلاک کی سوئیاں نو بجا رہی تھیں۔ انھوں نے جلدی جلدی باقی کام نمٹایا اور آخر میں ڈائری اٹھا کر کمرے کا تنقیدی جائزہ لے کر دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آ گئیں۔ ڈائری سنبھال کر انھوں نے کچن کا رخ کیا وہاں کھڑے خانساماں کو ارسل کو جگانے کے لیے بھیجا اور خود ناشتہ بنانے لگیں۔

digest novels lovers group

''ماما ناشتہ پلیز بہت بھوک لگی ہے۔'' ابھی وہ برتن ٹرے میں سیٹ کر رہی تھیں کہ اس کی پکار پر اندر تک سرشار ہو گئیں اور جب وہ ناشتہ ٹیبل پر لے کر آئیں تو وہ تولیہ کرسی کی پشت پر پھیلا رہا تھا۔

''السلام علیکم ماما۔'' اس نے خوبصورت انداز میں کہا تو انھوں نے بھی مامتا بھرے انداز میں اس کی پیشانی چوم لی۔

''وعلیکم السلام بیٹا جیتے رہو زندگی کی ڈھیروں خوشیاں تمہارا مقدر ہوں۔'' اور اس قسم کی ڈھیروں دعائیں اسے دے ڈالیں۔

جلدی جلدی ناشتہ ختم کر کے وہ تیار ہونے چل دیا اور وہ خود فون کی بجتی بیل کی طرف متوجہ ہوگئی۔ فون آپا کا تھا۔

''زری تیری بیٹی دشمنوں میں گھر گئی ہے۔ اگر اسے بچانا چاہتی ہو تو فوراً آ جاؤ۔''

اور اس کے فوراً بعد ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

ارسل جب تیار ہو کر انگلی میں کی رنگ گھماتا ڈرائنگ روم میں ڈداخل ہوا تو وہ بڑی بے چینی سے ٹہل رہی تھیں۔

''ارسل ..... ارسل مجھے جلدی سے میری بیٹی کے پاس لے چلو وہ بڑی مشکل ہیں ہے۔'' ان کے لہجے میں کیا نہ تھا۔ بے چینی و بے بسی حسرت و پریشانی سب کچھ۔

.....

ڈور بیل دینے پر جس ہستی نے دروازہ کھولا وہ اسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ انتہائی بے چینی سے آگے بڑھ کر ماں نے بیٹی کو خود سے لپٹا لیا۔

اس نے ایک نظر گیٹ کے باہر کھڑے ارسل پر ڈالی اور ان کے دونوں ہاتھ جھٹک کر واپس پلٹ گئی تو وہ بھی تیز تیز قدم اٹھاتیں اس کے پیچھے پیچھے چلی آئیں۔

لاؤنج سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلی آئی تو وہ بھی اس کے پیچھے ہی آ گئیں۔

''نینی میری بچی' میری بیٹی۔'' ان کے لہجے میں مامتا کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

''مت کہیں مجھے اس طرح اب میں ان احساسات سے باہر آ گئی ہوں۔'' اس کی آواز رندھ گئی۔

''ایسا نہ کہو میری جان۔'' وہ تڑپ اٹھیں۔

''کیوں نہ کہوں۔'' اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

''کیا دیا ہے آپ نے مجھے؟ کتنا ترسی ہوں میں آپ کے منہ سے یہ لفظ سننے کے لیے۔ کتنا جی چاہتا تھا میرا کہ آپ مجھے بانہوں میں بھر کے سینے سے لگا کر پیار کریں۔ لیکن..... لیکن آپ نے تو کبھی نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ تو پھر آج مجھے بیٹی کہنے کا کیا جواز ہے آپ کے پاس؟''

وہ آنسو پونچھتی نفی میں سر ہلاتیں اس کے قریب آ بیٹھی اور اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر بیڈ پر بیٹھا کر خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ اور اس کے دونوں نرم ہاتھ اپنے نرم و کمزور ہاتھوں میں تھام لیے۔

''تو کیا جانے کتنا تڑپی ہوں میں تیرے لیے۔ اس بھری دنیا میں تو ہی تو واحد آسرا ہے میرے جینے کا۔ ایک تو ہی تو ہے جس سے میری سانسوں کی ڈور بندھی ہے۔ میں نے تیرے بغیر یہ زندگی کیسے گزاری ہے یہ صرف میں یا میرا خدا جانتا ہے۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک پل تیری زندگی' تیری خوشیوں کی دعائیں مانگی ہیں میں نے خدا سے۔'' ان کے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے مگر پھر بھی دھیرے دھیرے بولتیں وہ اسے یقین دلا رہی تھیں۔

''تو پھر کیوں کیا آپ نے میرے ساتھ

ایسا کیوں مجھے دوسروں کی گود میں ڈال کر لاتعلق ہوگئیں۔''

''صرف اور صرف تیری خوشیوں کی خاطر۔ کیا تھا میرے پاس جو میں تجھے دیتی میں جانتی تھی کہ میں اس بھری دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور پھر مجھے ماں کی مامتا دیتی تو باپ کی شفقت کہاں سے لاتی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم کسی محرومی کا شکار ہو میں تمہاری شخصیت میں بھرپور اعتماد دیکھنا چاہتی تھی۔ لاتعلق اس لیے ہوگئی کہ کہیں تم دو کشتیوں کی سوار نہ بن جاؤ اور نتیجے میں نہ ادھر کی رہو نہ ادھر کی۔ تمہیں بکھرنے سے بچانے کے لیے اپنے دل پر صبر کی بھاری سل رکھ لی۔ تمہارے لیے تڑپتی رہی مچلتی رہی راتوں کو اٹھ اٹھ کر تمہیں پکارتی رہی۔ خدا کے سامنے سجدے میں گر کر تیرے لیے خوشیاں اور اپنے لیے صبر مانگتی رہی۔'' ان کے لہجے میں حسرتیں گونج رہی تھیں۔ تنہائیوں کے زخم چیخ رہے تھے۔ وہ تڑپ اٹھی۔

''ماما۔'' وہ کہہ کر ان کے سینے سے لگی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کافی دیر تک دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے میں مدغم رہیں۔ اور پھر جب آنسوؤں کا طوفان تھما تو انھوں نے اپنا ایک ایک زخم کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اپنی زندگی کے گزرے پچیس سالوں کا ایک ایک لمحہ اسے کہہ سنایا۔ اور اس کے دل پر چھایا احساس کمتری و محرومی کا غبار آہستہ آہستہ دھلنے لگا۔ اور پھر وہ ایکدم ہی ہلکی پھلکی ہوگئی۔

''ماما میں آپ کے لیے بہت ترسی ہوں بہت تڑپی ہوں آپ کی دوری کو اپنے دل پر محسوس کیا ہے۔ انکل منصور کی وفات پر میرا دل آپ کے لیے خون کے آنسو روتا رہا۔''

''تو پھر تم میرا غم بٹانے کیوں نہ آئی؟''

''اس لیے ماما کہ وہ جو اک شخص خواہ مخواہ ہی مجھ سے بدظن تھا وہ آپ سے بھی بدظن نہ ہو جائے۔ اور یہ نہ سمجھنے لگے کہ ہم دونوں ماں بیٹی نے مل کر واقعی اس کے گرد کوئی جال بنا ہے۔''

''کون ارسل؟ وہ نہ سمجھے والے انداز میں بولیں اور پھر ایکدم چونکیں۔''

''ارے وہ تو میرے ساتھ آیا.....'' وہ یہ کہہ کر اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھیں اس وقت دروازہ کھلا اور نائمہ اندر چلی آئی۔

''اب آپ آ بھی جائیں میں کتنی بار آپ دونوں کو دیکھ کر واپس جا چکی ہوں۔ لاؤنج میں سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی کوفت تھی۔

''ارے ہاں بیٹا ہم بس آ ہی رہے تھے۔ وہ ارسل آیا تھا میرے ساتھ۔''

''جی آنٹی وہ تو باہر سے ہی واپس جا رہے تھے لیکن پھر ادھر سے زین آ گیا تو انھیں اندر لے آیا لیکن وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس چلے گئے کہہ رہے تھے انھیں جلدی پہنچنا ہے۔'' وہ ان کے ساتھ چلتی ہوئی بولی۔

جب وہ لاؤنج میں داخل ہوئیں تو اماں کے ساتھ ساتھ دادو اور دونوں پھپھویاں بھی موجود تھیں۔ زرینہ کو انھیں دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی کہ تنویہ ان کی آمد کا پہلے ہی بتا چکی تھی۔

''السلام علیکم۔'' انھوں نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور ساتھ ہی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو دادو نے دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میں تیرے سلام کے قابل نہیں ہوں بیٹی۔ میں نے بہت ظلم کیے ہیں تم پر۔ بہت زیادتیاں کی ہیں تمہارے ساتھ۔ میں تو تم سے معافی مانگنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔'

''نہیں آنٹی ایسے نہ کہیں میں نے تو آپ کو اسی دن معاف کر دیا تھا جب میں دوسری دفعہ اپنے باپ کے گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ اس

میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میری تو قسمت میں ہی ایسے لکھا تھا۔'' زرمینہ نے کہا تو وہ تینوں ماں بیٹیاں ندامت سے پانی پانی ہو گئیں۔

''تم..... تم واقعی بہت عظیم ہو میرے حیدر کی پسند واقعی لاجواب تھی یہ تو میری ہی عقل پر پردے پڑے تھے کہ میں تجھے سمجھ نہ پائی۔''

اور پھر دونوں پھپھویوں نے بھی باری باری معافی مانگی۔ جس کو انھوں نے کھلے دل سے قبول کیا۔ اس کے بعد بہت سے گذشتہ واقعات کی باتوں کے بعد وہ لوگ حال میں لوٹیں۔

''زرمینہ میں اپنی بچی کے لیے بہت ترسی ہوں۔'' انھوں نے اپنے ساتھ بیٹھی تنوینہ کا سر اپنے شانے سے لگالیا۔

''اور اب میں چاہتی ہوں کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے پاس رہے۔ آج میں تجھ سے اپنے پوتے عمر کے لیے تنوینہ کا ہاتھ مانگتی ہوں۔ دیکھو انکار مت کرنا۔'' انھوں نے بڑی آس کے ساتھ ان کی طرف دیکھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے آنٹی لیکن اس کی زندگی کے تمام فیصلوں کا اختیار خود اس کے بعد آپا کے پاس ہے جو بھی فیصلہ کریں۔'' انھوں نے یہ کہہ کر آپا کی طرف رخ موڑا۔

''کیوں آپا میں بھی تو تمام زندگی اپنی بیٹی کے لیے تڑپتی رہی ہوں۔ اور اگر آج میں آپ سے اس کو مانگوں تو آپ انکار تو نہیں کریں گی؟'' انھوں نے کہا تو آپا نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''دراصل آپا میں اپنے بیٹے ارسل کے لیے آپ کی بیٹی کا ہاتھ مانگ رہی ہوں اس امید کے ساتھ آپ انکار نہیں کریں گی۔'' ان کی بات پر وہاں موجود ہر فرد کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ اور پھر چند ہی لمحوں بعد آپ کے چہرے پر رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔ ان کی تو خوشی دیدنی تھی۔

''زری میری بہن مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے وینہ کل بھی تیری امانت تھی میرے پاس اور آج بھی تیری امانت ہے تو جب چاہے اسے لے جا۔'' انھوں نے زرمینہ کا ہاتھ تھام کر انتہائی پرجوش انداز میں کہا۔

''شکریہ..... شکریہ آپا۔''

''آہا آپا کی شادی ہوگی۔

''آہا آپی دلہن بنیں گی۔

''آہا آپا کی بارات آئے گی۔''

زین نائمہ کے دونوں ہاتھ تھام کر گھومتے ہوئے نعرے لگانے لگا۔

''سٹاپ اٹ۔'' تنوینہ کی چیختی آواز پر ان دونوں کی زبان کے ساتھ ساتھ ٹانگوں کو بھی بریک لگ گئے۔ انھوں نے اس کی طرف دیکھا تو مٹھیاں بھینچے کھڑی تھی۔ اور سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''لیکن مجھے اس سے انکار ہے۔ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔'' اس نے تیز اور اٹل لہجے میں کہا اور باہر نکل گئی۔

جبکہ اماں کے ساتھ ساتھ زین اور نائمہ بھی حیرت و پریشانی سے کھڑے اسے جاتا دیکھتے رہ گئے۔ البتہ دادی اور پھپھویوں کے تاثرات مختلف تھے۔

''آپا آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' زرمینہ نے زرینہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے تسلی دی۔

''کیسے ٹھیک ہو جائے گا زری یہ لڑکی ہمیشہ اپنی من مانی کرتی آئی ہے لیکن اب میں اس کی ایک نہیں چلنے دوں گی۔'' ان کے لہجے میں پریشانی کے ساتھ ساتھ فیصلے کا عنصر بھی نمایاں تھا۔

.....

کمرے میں لیٹے لیٹے ایکدم ہی گھٹن کا

احساس بڑھنے لگا تو وہ باہر برآمدے کی سیڑھیوں میں ننگے پاؤں ٹھنڈے فرش پر آن بیٹھی۔

''ارسل کاش کہ یہ تم نہ ہوتے تو آج میں اپنی ماں کو مایوس و نامراد نہ لٹاتی۔ آج پہلی بار تو میری ماں نے مجھے بیٹی کہا تھا۔ آج ہی تو مجھے حقیقی ماں کا لمس محسوس ہوا تھا۔ اور آج تم میری خوشیوں کی راہ میں آ گئے۔''

لیکن خوشیاں تو شاید اب کبھی مقدر نہ ہوں کتنی بیوقوف تھی میں کہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی شعلوں سے دوستی کر بیٹھی۔ آخر کیا بگاڑا تھا ارسل میں نے تمہارا کہ تم نے اس طرح میری ذات کی دھجیاں بکھیر دیں۔ تم چاہے ہمیشہ مجھے اپنی نفرت سے نوازتے رہتے لیکن اس طرح میرا اعتماد تو ریزہ ریزہ نہ کرتے۔ اپنے اندر لگی آگ میں مجھے تو یوں جلا کر بھسم نہ کرتے۔

''یا خدا میں کیا کروں؟'' اس نے بے بسی سے تاروں بھرے آسمان پر نظریں گاڑھ دیں جہاں اب آدھی رات گزرنے کے بعد آخری تاریخوں کا چاند بھی نمودار ہو چکا تھا۔

''ان ستاروں بھرے آسمان میں کیا میری قسمت کا کوئی ستارہ نہیں؟'' اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر گود میں گرنے لگے۔

''اے میرے پروردگار آخر یہ تیرا کیسا نظام ہے کہ باوجود اتنی نفرت سہنے کے اس کی محبت قطرہ قطرہ کر کے میری نس نس میں سرایت کر گئی ہے۔ اور اب لاکھ کوششوں کے بعد بھی اس سے نفرت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ کیوں..... آخر کیوں؟'' نڈھال سی ہو کر اس نے ستون سے سر ٹیک دیا اور آنسو روانی سے بہنے لگے۔

اگلے دن یونہی نڈھال و بے کیف گزر گئے۔ اماں سمیت نائمہ اور زین بھی اس سے ناراض تھے۔ لہٰذا اس نے بھی خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ لیکن اس خاموشی میں بھی نجانے وہ کس بات کی منتظر تھی کہ ہر آہٹ پر چونکتی' ہر فون کی ہر بیل پر دوڑتی۔ لیکن پھر مایوس لوٹ آتی۔ اور جب ناامیدی نے پوری طرح اسے اپنے گھیرے میں لے لیا تو اس نے دادو کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ سٹاپ پر کھڑی وین کا انتظار کر رہی تھی جب ارسل منصور نے اپنی گاڑی عین اس کے سامنے لا کھڑی کی۔

''آؤ بیٹھو۔'' اس کے کہنے پر وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر لاتعلقی سے کھڑی رہی تو وہ گاڑی سے نکل کر قریب چلا آیا۔

''گاڑی میں بیٹھو ورنہ میں تمہیں اٹھا کر بھی اندر پٹخ سکتا ہوں۔'' اس نے ہلکے لیکن مستحکم لہجے میں کہا تو وہ اردگرد کھڑے لوگوں کو دیکھنے لگی جو انھیں بڑی مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ چونکہ اس کے انداز بتا رہے تھے کہ جو اس نے کہا ہے اس پر عمل بھی کر دکھائے گا۔ لہٰذا وہ آہستہ آہستہ چلتی گاڑی کے قریب آ گئی۔ اس کے فرنٹ ڈور کھولنے پر خاموشی سے فرنٹ سیٹ پر آن بیٹھی تو اس نے تمام دروازے لاک کیے اور سیدھا ہو بیٹھا۔

''ہاں تو اب سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم میرے اور اپنے تعلق سے شروع سے آگاہ تھیں۔''

''شروع سے نہیں انکل کی وفات پر معلوم ہوا تھا۔'' اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

''تو پھر بھی تم نہیں آئیں' ماما کے بہانے ہی چلی آتیں۔''

''ہوں تاکہ آپ یہ سمجھتے کہ آپ کو ٹریپ کرنے کے لیے ہم دونوں ماں بیٹی نے مل کر جال بچھایا ہے۔'' اس کے انتہائی طنزآمیز لہجے میں کہنے پر اس نے لب بھینچ لیے۔ اور چند لمحوں

بعد کچھ سوچتا ہوا گویا ہوا۔
''ہاں ممکن ہے ایسا ہی ہوتا کیونکہ میں ان دنوں ہر بات کو نیگٹیو پوائنٹ پر سوچتا تھا۔''
''لیکن اب تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟''
وہ کچھ نہیں بولی۔
''سنو!.....انکار کیوں کیا؟''
''میری مرضی۔'' وہ رکھائی سے بولی تو وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔
''تنویہ حیدر مجھے احساس ہے کہ میں نے زیادتی کی ہے۔ اس کے لیے میں تم سے سوری کرنا چاہتا تھا لیکن میرے پاس تمہارا کوئی کانٹیکٹ نمبر نہیں تھا۔ چاہتا تو ماما سے لے سکتا تھا لیکن میں تم سے روبرو بات کرنا چاہتا تھا۔''
وہ گاڑی کو مناسب رفتار سے ڈرائیو کرتا ہوا بول رہا تھا۔ ''مجھے یہ معلوم ہے کہ میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ غلط رویہ روا رکھا۔ اس کے لیے میں تم سے معذرت چاہتا ہوں یقین جانو کہ میں اپنے رویے سے خود بہت شرمندہ ہوں اور یہی وہ شرمندگی تھی کہ جس نے اتنے دنوں تمہارے پاس آنے سے روکے رکھا کہ نجانے تم مجھے معاف بھی کرو گی کہ نہیں لیکن آج جب دل نے ہمت بندھائی اور ساتھ یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ تم میری محبت ہو اور محبتیں کبھی روٹھا نہیں کرتیں۔ پلیز آئی ایم سوری۔'' کہہ کر اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی گود میں رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھنا چاہا تو اس نے فوراً ہاتھ ہٹا لیا۔
''مسٹر ارسل منصور۔'' اس کی تنبیہہ آواز ابھری۔
''عورت اتنی بے وقعت اور اس کی عزت اتنی سستی نہیں کہ جب جی چاہے اسے ذلیل کر کے رکھ دو اور جب چاہے سوری کہہ کر سمجھیں ہم نے اپنا حق ادا کر دیا۔'' اس کے لہجے میں غراہٹ تھی کہ آخر تھی تو وہ عورت جسے اپنی انا' اپنی عزت نفس سب سے زیادہ عزیز تھی۔
''اوہ۔ آپ کہہ رہے ہیں زیادتی.....زیادتی تو بہت چھوٹا لفظ ہے مسٹر ارسل آپ نے تو ہمیشہ مجھے ذلیل کیا ہے' تحقیر کی ہے' میری آپ کی ہمیشہ یہی خواہش اور کوشش رہی کہ میں آپ کا آفس چھوڑ کر چلی جاؤں۔ لیکن میں نہیں جا سکتی تھی کیونکہ مجبور تھی۔''
''تنویہ پلیز میں نے کہا نا کہ مجھے احساس ہے اپنی زیادتیوں کا اور اب میں ان کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں لیکن اب.....؟''
''لیکن اب مجھے عمر بھر کے لیے آپ کی زرخرید غلام نہیں بننا۔'' اس نے اس کی بات کاٹ کر دوٹوک انداز میں کہا تو وہ سب بھینچ گیا' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ گویا ہوا۔
''تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟''
''ہاں یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''
''ایک دفعہ پھر سوچ تو تنویہ حیدر۔'' اس نے ہلکی سی آواز میں کہا۔ ''کہیں ایسا نہ ہو کہ اس ضد بازی میں ہم دنوں کی زندگی برباد ہو جائے۔''
''میری بربادی یا آبادی سے آپکو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ اور رہا سوال آپ کا تو آپ کسی بھی شریف و باکردار اور اپنی حیثیت کی لڑکی سے شادی کر کے خوش رہ سکتے ہیں۔''
''بکومت۔'' وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''تم یہ سب کچھ اس لیے کہہ رہی ہو کہ تم کچھ نہیں جانتی۔'' وہ نارمل لہجے میں بولا۔
''مجھ کچھ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' وہ تیزی سے بولی۔
''تنویہ پلیز اتنی بدگمان مت ہو مجھ سے' بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔''
''میں کچھ بھی سمجھنا نہیں چاہتی۔''

''اوہ نو۔ پھر وہی مرغی کی ایک ٹانگ۔''
اب کے اسے ہی غصہ آ گیا۔
''جی تو چاہتا ہے کہ آج واقعی گاڑی کہیں دے ماروں اور اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی ختم کر دوں۔'' اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔
''تو آج آپ اپنا یہ شوق بھی پورا کر لیجیے۔ کیونکہ آپ کے ساتھ جی جی کر مرنا اور مر مر کر جینے سے تو بہتر ہے ایک ہی دفعہ مر جاؤں۔'' وہ مجبوری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ نجانے اسے اتنا تنگ کرنے میں کیوں مزا آ رہا تھا۔ وہ بھی تو ہمیشہ تنگ کرتا آیا تھا تو اب وہ کیسے اتنی جلدی ہار مان لیتی۔
''ادھر دیکھو میری طرف۔'' اس نے اس کی کلائی پکڑ کر اپنی طرف موڑا۔
''کیا اتنی نفرت کرتی ہو مجھ سے؟'' اس کے لہجے میں بے پناہ افسردگی تھی۔
''ہاں یا ناں یہی جواب دو۔''
اس نے ایک ایک جھٹکے سے کلائی چھڑوائی۔
''نہ تو میں کسی سے نفرت کرتی ہوں اور نہ محبت۔'' اس کے گول مول جواب پر وہ مسکرا دیا۔
''تو چلو اس کا فیصلہ شادی کے بعد ہو جائے گا۔''
''جی نہیں شادی انسان اس سے کرتا ہے جو ذہن و دل سے قبول ہو۔''
''تو کیا میں اتنا ہی برا ہوں کہ تمہارا دل مجھے قبول نہیں کر رہا؟'' وہ اس کے سوال پر گڑبڑا گئی۔
''میں اپنی نہیں آپ کی بات کر رہی ہوں۔'' وہ ہونٹوں پر آنے والی ہلکی سی مسکراہٹ چھپانے کے لیے رخ پھیر گئی۔
لیکن اس کا جواب ہی تمام راز افشاء کر گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ بے جا کی ضد ہے۔

''تنویہ پلیز اس ضد بازی میں پہلے ہی بہت سا قیمتی اور خوبصورت وقت ضائع ہو چکا ہے۔ اب یہ فضول کی ہٹ دھرمی چھوڑو اور ہاں کہہ دو۔'' اور وہ بھڑک ہی تو اٹھی تھی اس کی بات پر۔
''ہٹ دھرمی.....؟ میں دکھا رہی ہوں یا آج تک آپ دکھاتے آئے ہیں؟'' اس کے کہنے پر اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''کیا مطلب؟'' وہ نہ سمجھنے والے انداز میں بولا۔
''اب آپ اتنے بچے نہیں کہ ہر بات کا مطلب میں ہی آپ کو بتاؤں۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔
''یعنی..... یعنی کہ تمہارا مطلب ہے کہ تم جانتی تھیں سب کچھ' میری کیفیت تم پر عیاں تھی۔ میری بے بسی سے واقف تھی تم۔'' اس کے لہجے میں حیرتوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔
''جی ہاں۔ صرف میں ہی نہیں سارا زمانہ آپ کی بے بسی پر ہنستا رہا ہے۔ آپ تو چلتا پھرتا اشتہار تھے ارسل منصور اب تو آپ کو بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہوگا کہ کسی بھی انسان کی حیثیت اور اہمیت پیسے سے نہیں ہوتی بلکہ ہر انسان چاہے وہ امیر ہو چاہے غریب اس کی اہمیت اپنی جگہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ آپ نے ہمیشہ میرے وجود کی نفی کی۔ خود کو باور کرانے کے لیے بار بار مجھے غربت کا احساس دلایا۔ مجھے ہمیشہ میری اوقات یاد دلاتے رہے۔'' وہ بولتی گئی اور وہ حیرت سے اسے تک گیا کہ اس نے اس کے کتنا اندر تک اتر کر اسے جانچا تھا اور ایک وہ تھا کہ ہمیشہ بے خبر ہی رہا۔
''تانیہ بالکل ٹھیک کہتی تھی کہ آپ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں یہ صرف گیدڑ بھبکیاں ہیں جس طرح رات کے اندھیرے میں گیدڑ اپنے

اندر کے خوف کو چھپانے کے لیے چیختا چلاتا ہے تو اس طرح آپ اپنی بے بسی چھپانے کے لیے میرے ساتھ ایسا سلوک کرتے رہے۔ اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ چمک تھی۔

''یوں..... تنوینہ حیدر تم..... تم۔'' اس کا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کیا کرے۔

''میں..... میں ہمیشہ یہ سمجھتا رہا کہ میں تمہارے ساتھ زیادتی کرتا رہا ہے اور تم ہمیشہ ضبط کرتی رہی ہو' لیکن نہیں تم ضبط نہیں کرتی تھیں بلکہ سب کے ساتھ مل کر میرا مذاق اڑاتی تھی۔ اور مجھے احساس ہی نہ ہوا۔ میں سچ مچ چلتا پھرتا اشتہار بن گیا۔ تمہاری محبت کا بورڈ منہ پر سجائے پھرتا رہا۔ کیا میں واقعی محبت کے معاملے میں اتنا کمزور اور بزدل ہوں اور تم اتنی مضبوط کہ اپنے جذبات و احساسات کی ہوا تک نہ لگنے دی۔ یا پھر میں ہی اتنا بے خبر رہا۔''

''ارسل صاحب عورت بظاہر بہت کمزور سہی لیکن اندر سے بہت مضبوط ہے اور وہ ہر اس نظر کو پہچانتی ہے جو اس پر اٹھتی ہے کہ وہ کس انداز میں اٹھتی ہے۔ لیکن جہاں انا و عزت کا سوال آجائے وہاں وہ اپنی انا برقرار رکھنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتی۔ اور عورت اتنی کم مایہ نہیں کہ وہ اپنے جذبات کی تشہیر سرعام کرتی پھرے۔'' وہ بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔ اس کی باتیں سن کر ارسل کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

''تنوینہ حیدر تم نے واقعی مجھے پاگل بنا دیا ہے۔''

''بنے بنائے کو پاگل بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' اس نے عجب بے نیازی سے کہا تو اس خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی تو چاہتا ہے تمہیں شوٹ کر دوں۔''

''بصد شوق۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''شٹ اپ۔'' اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور وہ بغور اسے دیکھے گیا کہ وہ اسے اس طرح ہنستے ہوئے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

اس کے اس طرح دیکھنے پر اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے اپنے چہرے پر بکھرتے رنگوں کو چھپانے کے لیے رخ پھر لیا اور اس کا یہ خوبصورت انداز اسے پاگل بنا گیا۔

''تنوینہ اب چاہے تو ہاں کہو یا نہ کہو' چاہے مجھے تمہیں اغواء کروانا پڑے لیکن اب میں تمہارے جملہ حقوق اپنے نام کروا کے رہوں گا۔''

''ہاں ایسی راہ میں پڑی چیز ہوں ناں۔''

''میں راہ میں پڑی چیزوں پر نظر نہیں ڈالتا۔ تم میرے لیے وہ ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔''

''ایسی لاعلم بھی نہیں۔'' اس نے ایک تفاخر سے کہا۔

''تنوینہ کیا تم میری تمام کوتاہیوں کے باوجود میری محبت قبول کر لو گی؟'' اس نے کہتے ہوئے بے یقینی سے ہاتھ بڑھایا۔

محبت قبول نہیں کی جاتی ارسل یہ تو وہ ہے جو خود بخود احساس کے دریچوں کو وا کرتی چلی آتی ہے۔'' اس نے اس کے مضبوط ہاتھ پر اپنا نرم و نازک ہاتھ رکھ دیا۔ جسے اس نے مضبوطی سے تھام لیا۔

''تھینکیو۔''

''تھینکیو تنوینہ تم نے مجھے نئی زندگی کی نوید سنائی ہے۔'' اس نے اس کی مسکراتی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ جہاں اسے اپنی خوشیوں کا سورج طلوع ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

digest novels lovers group